معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ساٹھ روپیے فی شمارہ پانچ روپیے

پاکستان میں سالانہ ایک سو پچاس روپیے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک پندرہ پونڈ یا چوبیس ڈالر

بحری ڈاک پانچ پونڈ یا آٹھ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ: حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

- سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں، بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY AZAMGARH

- رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔
- خط و کتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

کمیشن ۲۵٪ ہوگا ——— رقم پیشگی آنی چاہیے۔

معارف اعظم گڈھ

کی

۱۵۱ ویں جلد

ماہ جنوری ۱۹۹۳ء تا ماہ جون ۱۹۹۳ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

فہرست

مضامین معارف

جلد ۱۵۱

ماہ جنوری ۱۹۹۳ء تا ماہ جون ۱۹۹۳ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

جلد ۱۵۱ ماہ رجب المرجب ۱۴۱۳ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۹۳ء عدد ۱

مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

ہندوستان کے مسلمان تیسرے درجہ کے شہری اور تعلیمی و معاشی اعتبار سے ہی پسماندہ نہیں ہیں، بلکہ وہ ہر میدان میں مجبور اور بے بس ہو گئے ہیں۔ ملک میں ان سے زیادہ بے وزن اور بے قیمت کوئی طبقہ نہیں ہے۔ زبانی تو ان سے ہمدردی، رواداری اور برابری کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ لیکن عملاً ان کی جان، مال، عزت اور آبرو سے مسلسل کھلواڑ ہو رہا ہے۔ ان کے ساتھ دوہرا برتاؤ کیا جا رہا ہے۔ ان کا امتیاز و تشخص ختم کرنے کے لیے اردو زبان کو مٹا دیا گیا اور ان کے اداروں کا اقلیتی کردار مسخ کر دیا گیا۔ ملک کے چپہ چپہ سے ان کی عظمت کی نشانیاں اور پُرفخر مذہبی، تہذیبی اور تعمیری یادگاروں کو معدوم کیا جا رہا ہے۔ اور اب فرقہ پرستوں سے سازباز کر کے عظیم الشان بابری مسجد اور اس کی لپیٹ میں درجنوں مسجدوں کو زمیں بوس کر دیا گیا ہے ؂

صبح تک وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے بادِ صبا ؛ یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک

اس پر بھی صبر نہیں ہوا تو مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہایا جا رہا ہے۔

بابری مسجد کی شہادت حکومت کی سراسر نااہلی اور وزارت داخلہ کی عمداً چشم پوشی اور مسلمانوں کے معاملات میں دوہرا معیار اختیار کرنے کا نتیجہ ہے جس سے ہندوستانی جمہوریت اور سیکولرازم کی جڑیں کھوکھلی ہو گئی ہیں۔ اور سارے عالم میں حکومت کی جگ ہنسائی ہو رہی ہے ؂

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا ؛ کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا

مگر حکومت کے ذمہ دار نہایت بے شرمی سے اپنی بے گناہی کا اعلان کیے جا رہے ہیں۔ ان کے خیال میں اُس وقت اتر پردیش میں بی۔ جے۔ پی حکومت تھی۔ لیکن مسجد کی جگہ پر مندر کی داغ بیل کب ڈالی گئی، اور اتر پردیش ہی نہیں پورے ملک میں جو خون ناحق بہہ رہا ہے۔ اس کا ذمہ دار کون ہے۔ بی۔ جے۔ پی حکومتوں کو برخاست کرنے والے بمبئی اور احمد آباد میں جنگل کے راج، غنڈوں کی حکومت اور پولیس کی درندگی کا تماشا دیکھ رہے ہیں۔ رام لعل ناجی کہتے ہیں "ملک میں غنڈہ راج ہو گیا ہے، گھر سے باہر نکلنا محال ہو رہا ہے" اور جگن ناتھ آزاد

لکھتے ہیں: "یہ زمانہ ہم لوگوں کے اپنے اپنے گوشۂ تنہائی ہی میں رہنے کا ہے۔ یہاں کے حالات بھی تو خراب ہی ہیں بلکہ خراب سے خراب تر ہوتے جا رہے ہیں ... خدا جانے اس ملک کا کیا انجام ہوگا۔" مگر اس کے باوجود ملک میں استحکام کے لیے حکومت کا باقی رہنا ضروری ہے۔

انگریزوں کے زمانے میں کانپور کی مسجد کا معمولی اور جزوی حصہ شہید ہو گیا تھا تو پورے ملک میں کہرام مچ گیا تھا۔ آج بھی علامہ شبلیؒ کی نظمیں ع ہم کشتگانِ معرکۂ کانپور ہیں۔ اور ؂

شہیدانِ وفا کی خاک سے آتی ہیں آوازیں ؛ کہ شبلی بمبئی میں رہ کے محرومِ سعادت ہے

فضا میں گونج رہی ہیں۔ لیکن قومی حکومت کے دور میں بابری مسجد کو ہضم کر لیا گیا اور مسلمان مجسم صبر و ضبط بنے رہے۔ کہیں کہیں کارسیوکوں اور شرپسندوں کی اشتعال انگیزی سے بعض نوجوانوں نے جوش و حمیت دکھائی تو وہی حکومت جو بابری مسجد کو ڈائنامائٹ سے اڑا دینے پر بھی چپ چاپ رہی تھی، سارے مسلمانوں کو گولیوں کا نشانہ بنانے کے لیے مستعد ہو گئی۔ درندگی پر آمادہ پولیس اور پی۔ اے۔ سی اپنا فرض منصبی ادا کرنے کے لیے گھروں میں گھس کر ان کو لوٹنے اور مارنے لگی۔ آتش زنی کر کے ان کو اور ان کی املاک کو برباد کرنے اور عورتوں کی عصمت دری کرنے لگی۔ بی۔ جے۔ پی کی حکومت بھی ہوتی تو کیا اس سے زیادہ ظلم ڈھاتی ع بلا سے قزاق آ کے لوٹے، یہ پاسبانوں کی لوٹ جائے۔

اگر حکومت واقعی نیک نیت ہوتی تو وہ مسجد کی ازسرنو تعمیر کے لیے مخلصانہ قدم اٹھاتی اور تشدد پسندوں کے دباؤ میں نہ آتی۔ لیکن وہ تو قوت اور تشدد ہی کے سامنے سرنگوں ہونا جانتی ہے۔ مسلمانوں کا مطالبہ کتنا ہی جائز اور حق پر مبنی کیوں نہ ہو، وہ کمزور ہیں۔ اس لیے ان کی بات ماننے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ان کی طفل تسلی کے لیے وہائٹ پیپر کی اشاعت اور سی۔ بی۔ آئی سے تحقیقات کرانے کا شوشہ چھوڑ دینا کافی ہے۔ آر۔ ایس۔ ایس، ہندو پریشد اور بجرنگ دل پر دکھانے کے لیے پابندی عائد کی گئی، تو جماعت اسلامی ہند کو بھی اسی زمرہ میں شامل کر لیا گیا جس کا فرقہ واریت سے دور قریب کا بھی واسطہ نہیں، اس نے ہمیشہ ملک و قوم کے مفاد کو پیش نظر رکھا ہے۔ اور مسلمانوں اور ہندوؤں کو بھائی بھائی بن کر رہنے،

اور خدا سے ڈرنے کی تلقین کی ہے۔ آج تک کسی شر و فساد میں وہ ملوث نہیں رہی ہے اور بلا امتیاز مذہب وملت ہر مظلوم کی مدد و حمایت کرتی رہی ہے۔ اور دوسری طرف بی. جے. پی اور شیو سینا کو ملک کا امن و امان درہم برہم کرنے کے لیے کھلی چھوٹ ملی ہوئی ہے۔ جبکہ ہر شخص جانتا ہے کہ ان ہی کی بدولت پانی سر سے اونچا ہوا۔ اور ملک کو یہ سیاہ دن دیکھنا پڑا۔

جس حکومت کے یہ کارنامے ہوں اس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ بابری مسجد کو دوبارہ بنوادے گی ع

ایں خیال است و محال است و جنوں

وہ تو مسجد کی جگہ مندر بنواکر رام للا کا درشن کرا رہی ہے اور پجاریوں کو سرد و گرم موسم سے بچانے کے لیے مزید تعمیرات کرا رہی ہے۔ وعدے سے کیا ہوا۔ وعدہ تو مسجد پر کوئی آنچ نہ آنے دینے اور انتخابی منشور میں سو دنوں میں مہنگائی پر قابو پانے کا بھی کیا تھا۔ جب وعدوں ہی سے کام چل جائے تو انھیں وفا کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ جس حکومت کا معیار سراسر دہرا اور جارحانہ ہو اور جو عدل و انصاف کے تقاضوں کو نہ پورا کرے اس سے مسجد کی بھیک مانگنا ننگ ہے۔ مانگنا ہے تو خدا سے مانگیے اور اسی پر بھروسہ کیجیے وہ اندھا بہرا نہیں ہے کہ اپنے گھر سے غافل ہو جائے اور اسے تباہ کرنے والوں کے کرتوت نہ دیکھے، وہ ظلم و ناانصافی کو برداشت نہیں کرتا۔ حق کبھی کبھی اوجھل ہو جاتا ہے لیکن مٹتا نہیں۔ مٹنا اور برباد ہونا تو باطل کا حصہ ہے: إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا۔

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ جن مسلمانوں نے جذبات سے مغلوب ہو کر مندر توڑے، ان کا فعل غیر اسلامی اور قابل مذمت ہے۔ ہم کو خوشی ہے کہ بعض مسلم ملکوں نے مسمار شدہ مندروں کو دوبارہ بنوانے کا فیصلہ کیا ہے ہندوستان کی حکومت مسجد کو اپنا داخلی معاملہ کہہ کر دنیا کی زبان بند نہیں کر سکتی۔ اس نے خود دوسرے ملکوں میں مندر توڑے جانے پر احتجاج کیا ہے۔ ملائم سنگھ یادو نے صحیح کہا کہ میں نے بابری مسجد کا تحفظ کر کے بہت سارے مندروں کو بچا لیا تھا۔ اگر موجودہ حکمرانوں نے بھی عاقبت بینی سے کام لیا ہوتا تو ردعمل کا یہ سلسلہ شروع نہ ہوتا۔ ردعمل بجائے خود غلط ہے لیکن اس کا موقع بابری مسجد اور اجودھیا کی دوسری مسجدوں کو نہ بچا کر خود ہماری حکومت نے دیا۔

مقالات

میر محمد مومن عرشی اکبرآبادی

از پروفیسر نذیر احمد

(۲)

۷۔ **میر عرشی کا کلام۔** عرشی ایک پختہ کلام شاعر تھا، چنانچہ خود اس کی زندگی میں اس کا کلام مدون ہو چکا تھا، اس کے دیوان کا جو نسخہ سالار جنگ میوزیم زیر شمارہ ۱۹۵۵/۷۷۵ ہے، اس کی کتابت کی تاریخ ۱۰۷۳ ہجری ہے یعنی وفات سے ۱۸ سال قبل، کلیات کا جو نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، ایونوف شمارہ ۹۱۷، ہے، وہ ۱۰۸۲ ہجری میں استنساخ ہوا (وفات سے ۹ سال قبل) کلیات کے اجزا یہ ہیں:

۱۔ دیباچہ بقلم، میر مومن عرشی ۱-۶ ورق — ۲۔ غزلیات بہ ترتیب تہجی ۶-۱۱۵ ورق
۳۔ قصائد ۱۱۵-۱۳۹ " — ۴۔ ترجیع بند ۱۳۹-۱۴۳ "
۵۔ ترکیب بند ۱۴۳-۱۵۰ " — ۶۔ مقطعات ۱۵۰-۱۵۷ "
۷۔ رباعیات ۱۵۷-۱۶۴ " — ۸۔ ساقی نامہ ۱۶۴-۱۷۰ "
۹۔ کتاب شاہد عرشی ۱۷۰-۲۲۳ " — ۱۰۔ مثنوی مہر و ماہ ۲۲۳-۲۸۹ "

دیوان عرشی سالار جنگ میوزیم کے اجزا یہ ہیں:

غزلیات بہ ترتیب تہجی ورق ۱-۱۰۳ — قصائد ورق ۱۰۴-۱۳۸
ترجیع بند ۱۳۸-۱۴۸ " — ترکیب ۱۴۹-۱۵۳ "

رباعیات   ورق ۱۵۴-۱۷۱   قطعات   ورق ۱۷۱ - ۱۸۰

اس کا کاتب ابو المعالی اور تاریخ کتابت ۱۴ رجادی الاول ۱۰۷۳ھ ہے، اسی ابو المعالی نے عرشی کے والد میر عبد اللہ مشکیں قلم کی مثنوی گلشن اسرار (مخطوطہ نمبر ۱۸۴۷) کی کتابت تین سال پہلے کی تھی، اس کا نسخہ سالار جنگ میوزیم میں ہے اور تاریخ کتابت ۱۴ صفر ۱۰۷۰ھ ہے[1]، دیوان کا ایک اور مختصر نسخہ اسی میوزیم زیر شمارہ ۱۹۵۶ ہے، جس میں کل ۸۴ اوراق ہیں، عرشی کے کلام کے اجزا یہ ہیں؛

۱۔ غزلیات ۲۔ قصائد ۳۔ ترجیع بند ۴۔ ترکیب بند ۵۔ قطعات ۶۔ رباعیات ۷۔ مثنویات۔ ساقی نامہ شاہد عرشی مہر و ماہ۔

غزلیات۔ عرشی اصلاً غزلگو شاعر ہے، اس کی غزلوں میں سادگی، رعنائی، سوز و گداز، جدت طرز، بلندی خیال کے اعلیٰ نمونے مل جاتے ہیں، چند مثالوں سے ان خصوصیات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

سرو در گلشن اگر یافتہ رعنائی را
قامت او علم آراستہ رعنائی را

در زمینی کہ شدہ کشت محبت سرسبز
نیم جو کس نخرد خرمن دانائی را

ای کہ پا می نہی اندر چمن عشق بتان
برسر خویش نہ اول گل رسوائی را

عرشی اندر زمزمہ سنجی سخنہائی بلند
برسرم بام فلک داشتہ ہمتائی را

در دور دو چشم تو بیدار کہ می باشد
در حلقہ سرمستان ہشیار کہ می باشد

در آئینہ چشمم بنگر تو بچشم خود
خونریز کہ می گردد خونبار کہ می باشد

با غم چو شد آمیزش از عیش کہ می پرسد
گر غم نخورد عاشق غم خوار کہ می باشد

[1] مخطوطہ ورق ۱۸۷و

از عشق تو لبریز است عرشی بنظر پنہان
چو جادہ بجام می سرشار کہ می باشد
(ورق ۵۸و)

امشب بسر کوی تو خوش انجمنی بود
از زلف تو ہر گوشہ پریشان سخنی بود

زلف و رخ او در نظر مست تماشا
آویختہ در سنبل تر یاسمنی بود

آن لالہ نبودہ است پیراہن رنگین
برشاخ تر آویختہ خونین کفنی بود

خوش وقت کہ در موسم آرایش گلشن
پیراہن گل جامۂ نازک بدنی بود

بوی گل گفتار شنیدیم درین باغ
در غنچہ تو گوئی کہ نشان دہنی بود

مستغنی نظارہ آرایش گل را
از زلف و خط و خال رخ او چمنی بود

امروز چو عرشی نبود زمزمہ سنجی
زین پیش اگرچہ بہ نزاکت حسنی بود[1]
(۴۴ب)

سخن چون ہم سخن گردد در آید در سخن عرشی
سخن زیب از سخن گیرد چمن از چمن عرشی

مسیحا درس می گوید بہ مکتب خانہ روشن
ملایک جملہ می خوانند باہم شعر من عرشی

پُر از لعل و جواہر میشود درج دہان من
زبان وقت سخن گردد چو در درج دہن عرشی

سواد کلک عنبر سای من گر نقطۂ ریزد
تو گوئی نقش شد بر صفحہ از مشک ختن عرشی

نزاکت با متانت جمع کردہ نکتۂ موزون
بود احسن اگر گوئی تو بر طرز حسن[2] عرشی

ہزاران آفرین گفتی بانصاف سخن سنجی
اگر قدسی ہمی بودی بدین طرز سخن عرشی

کہن را تازہ می سازند زنان سخن سنجان
بتو شد تازہ گوئی ختم در دور کہن عرشی
(ورق ۱۰۳)

ذیل میں صاحب گلشن کے انتخاب کے اشعار درج کیے جاتے ہیں:

کشاد غنچہ اگر از نسیم گلزار است
کلید قفل دل ما تبسم یار است

[1,2] اشارہ ہے حسن دہلوی کی طرف جن کی زمین میں عرشی نے غزلیں لکھیں، مطالعے کا یہ اچھا موضوع ہے۔

سیاہ بختی پروانہ بیشتر زین نیست　　که روی شمع نمایند و سوختن ندہد

چاکیست سینہ را کہ بوقت رفو زدن　　صد قطرۂ خون ز دیدہ سوزن فرو چکید

اگر صد تیشہ آید بر سرش آسان بود عرشی
ازان پرسش کہ از پرویز بر فرہاد می آید

خدنگ غمزۂ او راست بر دلم آمد　　چو طایری کہ کند قصد آشیانۂ خویش

بنمای جمال خود ورنہ ز شہر مستی　　بہتری ز دہان تو می گویم و می رقصم ؟

من بپایم افتم و او در کنارم می کشد
من درین وادی ترقی از تنزل دیدہ ام

قصائد :۔ میر مومن عرشی کے اکثر قصیدے مذہبی ہیں اور ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ عرشی کو خاندان کے دوسرے افراد کی طرح اہل بیت سے بڑی عقیدت تھی، عرشی کے بڑے بھائی میر صالح کشفی ولائے اہل بیت میں شاید سب سے بڑھے تھے، اسی جذبہ کے تحت انھوں نے مناقب مرتضوی جیسی ضخیم کتاب لکھی، غالباً انہیں وجوہ سے ان پر رفض کا الزام لگایا گیا، انھوں نے نہایت پُر زور انداز میں ثابت کیا ہے کہ محبت اہل بیت ایمان کا جز ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں :

منم پاک و پیرو شرع رسول اللہ　　ز عشق مرتضیٰ نادان بہ رفضم متہم دارد

اگر عشق علی رفض است پس رفض است ایمانم　　خدا زین شیوہ در محشر مرا بس محترم دارد

امیر المومنین حیدر علی ابن ابی طالب　　چو دارد حامی خود کشفی از دشمن چہ غم دارد

عرشی اس معاملے میں اپنے بھائی کے نقش قدم پر چلے اور اگرچہ ان کے یہاں اہل بیت سے بے پناہ محبت کا جذبہ موجود ہے لیکن اس جذبے میں وہ شدت نہیں

جو کشفی کے یہاں ملتی ہے۔ بہرحال عرشی کے بیشتر قصائد مذہبی ہیں، ان میں اہل بیت کی مدح ملتی ہے، دو قصیدے شاہجہان کی مدح میں ہیں اور دو عالمگیر کی، حسب ذیل پانچ قصیدے حمد اور نعت میں ہیں :

دل بود آئینہ و آئینہ دان او جہان
آن جہان بینی اگر بیرون کنی ز آئینہ دان

للہ الحمد کہ از لطف عمیم دادار　　کہ بود ہر ورد جہانش اثری از آثار

ای قد موزن تو سرو ریاض صفا　　چشم سیاہت بود نرگس باغ حیا

می شد رخسار او از دود آہم پر غبار　　گر نگہ وی اشک طوفان موج من بروی گذار

توسن مہر زیر ران دارم　　سیر بر اوج آسمان دارم

یہ قصیدہ حضرت علیؑ کی منقبت میں ہے۔

ای صبح از خیال رخت در بر آفتاب　　وی تنگ جامہ صبح ز شوقت بر آفتاب

در منقبت امام حسن :

بباغ حسن تو یک گل بود ہزار چمن　　بہر چمن گل خورشید و ہر گلی روشن

در منقبت امام حسین :

ز فرقت بود داغ بر جگر لالہ　　شدہ بداغ جگر در جہان سمر لالہ

در مدح امام باقر :

ز چشم مست تو دارد بخون کشان نرگس　　شد ست چشم و چراغ چمن ازان نرگس

در مدح امام جعفر :

گر بر افروزد ببزم بوستان رخسار گل　　مرغ را پرواز سازد بر سر دیدار گل

در منقبت امام :

اگر زروی دلم غمگسار پوشد چشم　　چنان بود که زگلشن بهار پوشد چشم

در مدح امام علی بن موسیٰ رضا :

زہی بزم و آن بادۂ مہرتاب　　که از بوی او جان و دلها خراب

در مدح امام عسکری :

همگنان در قال اگر دارند با من همسری　　لیک در حال سخن دارم از ینها برتری

در مدح جعفر طیار :

هر که را لب خشک از دود دل و چشم تر است　　می نوازد گوش شاهی گوشه بحر و بر است

اگرچہ عرشی نے قصیدہ نگاری پر بڑا زور صرف کیا ہے، لیکن ان کے قصیدوں میں غزل گوئی کی صفت پیدا ہو گئی ہے، حضرت امام حسینؓ کی مدح میں جو قصیدہ ہے اسمیں وہ زور، جوش نظر نہیں آتا ہے جو فارسی قصیدہ نگاری کا امتیازی وصف ہے، البتہ شاعر نے نئے نئے شاعرانہ نکتے پیدا کر کے اس نظم کو کافی موثر بنایا ہے، یہ قصیدہ نہیں بلکہ مرثیہ ہے ؎

ز فرقت تو بود داغ بر جگر لاله　　شده بداغ جگر در جهان سمر لاله

ز گریه شب و روز است عاشقان ترا　　گهی بچشم سمن گاه در نظر لاله

چو غنچه در دل خود داشت داغ عشق نهان　　چو گل شگفت و عیان ساخت بر جگر لاله

نبود ز آتش عشقت خبر که اندر باغ　　ز دود غم جگر افروخت بی خبر لاله

بباغ هر شجری را بود ثمر پیدا　　ز داغ یافت بگلزار دل ثمر لاله

اگرچه در چمن آید بجامهٔ گلگون　　ز باد حادثه ها هست در خطر لاله

شهید گشته و خونین کفن بسر دارد　　بجنگ دشمن دین بسته بد کمر لاله

شهید دشت محبت شده امام حسین　　از آن بجامهٔ خونین شده سمر لاله

چکیده خون شهیدان کربلا بزمین　　ز جای خاسته خونین کفن ببر لاله

امام باقر کی مدح میں جو قصیدہ ہے وہ عرفی شیرازی کے جواب میں ہے، دونوں ایک ہی زمین میں ہیں اور دونوں کی ردیف نرگس ہے۔ لیکن جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ عرشی کے قصیدہ میں غزل کی شان پیدا ہو گئی، دونوں شاعروں کے چند اشعار بالمقابل درج کیے جاتے ہیں :

عرشی نے انوری کی زمین[1] میں ایک قصیدہ لکھا ہے جو حقیقۃً میر صالح کشفی کی مدح

---

[1] عرشی کا یہ قصیدہ دراصل اس کے بھائی میر صالح کشفی کی مدح میں ہے، جس کے متعدد اشعار کشفی کے ذیل میں نقل ہو چکے ہیں، شروع کے چند اشعار میں ہندی، فارسی، عربی زبانوں کا ضمنی ذکر ہے، قرآن فارسی میں ہے، یہ اس کی عظمت کی دلیل ہے :

عربی فارسی و پس هندی　　اصطلاح جهانیان باشد

ترجمه شد به فارسی قرآن　　فارسی را قبول از آن باشد

هندی از فارسی شود چون بیش　　بر سر هر زبان روان باشد

آگے کے دو شعر میں اپنے وطن خراسان کی یاد تازہ کرتا ہے، واضح رہے کہ ترمذ خراسان میں شامل سمجھا جا سکتا ہے، مگر یہ شہر اس کے اجداد کا مسکن تھا، اس سے اتنی لگن کیوجہ زیادہ معقول نہیں۔

ما فراموش چون کنیم وطن　　تو امان با وطن که جان باشد

از خراسان چو دل بیاد آرد　　فاتحه خوان سیدان باشد

(سیدان سے مراد شاہ طیب اور شاہ نعمت اللہ ولی ہوں گے)

میں ہے، اس کے کچھ اشعار کشفی کے ذیل میں نقل کیے جا چکے ہیں، چند اشعار عرشی اور انوری کے ایک دوسرے کے بالمقابل نقل کیے جاتے ہیں:

عرشی دیوان ۱۳۳ ب	انوری دیوان ص ۱۳۵
تازبان در دہان روان باشد	گر دل و دست بحر و کان باشد
وصف تو بر سر زبان باشد	دل و دست خدایگان باشد
من سپہرم جہان معنی را	شاہ سنجر کہ کمترین بندہ اش
لفظ من وسعت جہان باشد	در جہان پادشہ نشان باشد
گرچہ من پیر گشتہ ام از فکر	پادشاہ جہان کہ فرمانش
سخن من ولی جوان باشد	بر جہان چون قضا روان باشد
تازہ گوئی بسی کند طبعم	آنکہ با داغ طاعتش زاید
گر سخن فہم در جہان باشد	ہر کہ ز ابنای انس و جان باشد
من چہ گویم سخن کہ اہل زمان	وانکہ با مہر خانہ اش روید
گر نفہمند ہیم آن باشد	ہر چہ از اجناس بحر و کان باشد
سخنم جان بود بجان سخن	دستہ خنجرش جہانگیر است
سخن تازہ موج جان باشد	گرچہ یک مشت استخوان باشد
ماہمہ خضر و آب ما سخن است	عدلش ار بازمین بخشم شود
سخن ما حیات جان باشد	امن بیرون آسمان باشد
ما ہنر را چگونہ بفروشیم	قہرش ار سایہ بر جہان فگند
ہنر ارزان و زر گران باشد	زندگانی در آن جہان باشد

لفظ ہندی سر زبان گیرد[1]	مرگ را دایم از سیاست او
فارسی در تہ زبان باشد	کی تب لرزہ اندر استخوان باشد

عرشی کا ایک ترجیع بند خصوصی اہمیت کا حامل ہے، اول یہ کہ اس میں ۲۸ بند ہیں، دوم یہ میر صالح کشفی اور سعدی شیرازی کے ترجیعات کے جواب میں لکھا گیا، سعدی کا ترجیع اتنی شہرت رکھتا ہے کہ متعدد شعرا نے اس کے مقابل میں ترجیع بند لکھے ہیں، ذیل میں سعدی، کشفی اور عرشی کے ترجیع بندوں کے ایک ایک بند درج کیے جاتے ہیں:

سعدی　　کلیات ص ۶۵۱

سعدی کے ترجیع میں ۲۱ بند ہیں، پہلا بند یہ ہے:

ای سرو بلند قامت دوست	وہ وہ کہ شمایلت چہ نیکو است
در پای لطافت تو میرد	ہر سرو سہی کہ بر لب جو ست
نازک بدنی کہ می نگنجد	در زیر قبا چو غنچہ در پوست
مہ پارہ ببام اگر بر آید	کہ فرق کند کہ ماہ یا اوست؟
آن خرمن گل نہ گل کہ باغست	نہ باغ ارم کہ باغ مینوست

---

[1] حکیم رکنای کاشی نے شاہجہاں کے جلوس کی تاریخ میں جو قطعہ لکھا ہے، وہ بھی اسی زمین میں ہے:

بادشاہ زمانہ شاہ جہان	خرم و شاد و کامران باشد
حکم او بر خلائق عالم	ہمچو حکم خدا روان باشد
ہر سال جلوس شہ گفتم	در جہان بادشاہ جہان باشد

(عمل صالح ج ۱ ص ۱۹۱)

آن گوی معنبرست درجیب	با بوی دہان عنبرین بوست
درحلقہ صولجان زلفش	بیچارہ دل اوفتادہ چون گوست
می سوزد وہمچنان ہوادار	می میرد و ہمچنان دعاگوست
خون دل عاشقان مشتاق	در گردن دیدۂ بلاجوست
من بندۂ لعبتان سیمین	کاخر دل آدمی نہ از روست
بسیار ملامتم بکردند	کاندر پی او مروکہ بدخوست
ای سخت دلان سست پیمان	این شرط وفا بود کہ بی دوست

بنشینم و صبر پیش گیرم
دنبالۂ کار خویش گیرم

میر صالح کشفی نے مجموعۂ راز کے نام سے ایک ترجیع بند لکھا تھا جو چھپ چکا ہے اور جس کے نسخے مل جاتے ہیں، اس کا[1] پہلا بند یہ ہے:

ای دوست بہ عاشقان شیدا	بنمای جمال عالم آرا
ای از تو شدہ ظہور کونین	اسرار نہان ز تو ہویدا
از نور تو روز و شب منور	عکس تو زمہر و ماہ پیدا
بردار تو جمال روی یوسف	آتش ز تو در دل زلیخا
خود آئینہ جمال پیش گشتی	خود چشم شدی و ہم تجلی
ارنی گفتی و لن ترانی	ہم طور شدی و ہم تجلی
پس بوالعجبی چگویم از تو	ہم کام بگوی ہم تمنا

[1] نسخۂ علی گڑھ ورق ۲۔

وصف تو چنان بشرح آرم	کز فکرت من بود مبرا
دل بی تو مدام باد پیماست	با دل سوی تو بادہ پیما

بنشینم و جام عشق نوشم
کونین بجرعۂ فروشم

عرشی کا پہلا[1] بند یہ ہے:

ای جلوہ فروز یوسفستان	خورشید نمای چشم حیران
برلخت دلم شدست ظاہر	لعلت نمکی کہ کردہ پنہان
آن جنبش زلف مشکبویت	داند دل عاشقان پریشان
برگریۂ زخم سینۂ چاک	از خندہ لب نمک بیفشان
یوسف بدر آمدہ ست از چاہ	این مژدہ برید سوی کنعان
آتش چو فرو گرفت در شمع	پس شعلہ کند چگونہ پنہان
من لالہ نیم کہ داغ سینہ	ظاہر سازم بہ صحن بستان
من غنچہ نیم کہ از نسیمی	بیہودہ شوم بہ باغ خندان
من مرغ چمن نیم کہ ہردم	از سینہ کشم ہزار افغان
پروانہ ام و بلند ہمت	خود را بزنم بشمع تابان
تن سوختہ عین شمع گردم	تا شعلہ کشم سر از گریبان
ای دوست تبسمی کہ تاکی	در موسم نو بہار خندان

[1] دیوان ورق ۱۳۰ اب، ترجیع بند کا ایک الگ نسخہ سالار جنگ میوزیم میں موجود ہے دیکھئے فہرست ج ۵ مخطوطہ نمبر ۱۸۵۵۔

بنشینم دردی زعفرانی

شویم بسرشک ارغوانی

سعدی کے ترجیع بند کے مطالعے کا حق اسی وقت ادا ہو سکتا ہے جب وہ سارے ترجیعات جو اس کے جواب میں لکھے گئے ہیں حاصل کیے جائیں اور انکا باہمی مقابلہ کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ خود ایک بڑا اور دلچسپ موضوع ہے اور الگ سے فرصت چاہتا ہے۔

عرشی کے مقطعات بعض اہم معلومات کا خزانہ ہیں، اگرچہ ان کی تعداد میرے مطالعے کے نسخے میں زیادہ نہیں، پھر چند کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں دو تین قطعے[1] حکیم رکنائے کاشی کی مدح میں ہیں، حسب ذیل قطعے میں حکیم کی فضیلت حکمت، شعر اور خطاطی بتائی ہے:

اگر تمام جہانست مست بادۂ لاف　　　حکیم رکن فضیلت جہان انصافست

بحسن طبع فلاطون بعلم لقمانست　　　کہ صیت فطرت فضلش زقاف تا قافست

بنظم دلکش او نظم ہیچکس نرسد　　　ہمان حکایت زر دوز و بوریابافست

بکام طبع جہان خوشگوار از ان نظمش　　　کہ لفظ و معنی او ہمچو بادہ صافست

اصول مردم پیش است در خطش پیدا　　　چہ شد اگر خط بی مغز دیگران صافست

جو منصفانہ سخن می سرائی ای عرشی　　　بگو بگو کہ حکیم جہان با نصافست

[1] ورق ۱۷۳و، ۱۷۷ اب، ۱۷۸ اب، ۱۷۹و، یہ آخری قطعہ درج نہیں کیا گیا۔ حکیم رکنا کاشی۔ جہانگیر کے عہد میں ایران سے ہندوستان آیا اور اسکے اطبا میں داخل ہوا، شاہجہان کا بھی شاہی طبیب رہا، ۱۰۴۲ میں مشہد مقدس کی زیارت کے لیے گیا، ۱۰۷۷ میں اسکا ایران میں انتقال ہو گیا۔

ایک اور قطعہ حکیم کی مدح میں یوں ہے:

ای بحکمت درین زمان رکنا　　　وی بہ دانش ارسطوی زمان

رای تو آفتاب شش جہتست　　　طبع تو ماہتاب چار ارکان

از تو دریافت رنگ لالۂ دل　　　وز تو دریافت بوی گلشن جاں

این ددانی کہ بہر من کردی　　　از تو خوشنود سرو مردان

بینظری ازان بد بہر ترا　　　برگزیدہ است پادشاہ جہان

لالۂ آفتاب در دستت　　　سمن مہ ترا بجیب نہان

نفت ردح پرور دلہاست　　　تو زحکمت شدی مسیح زمان

ہرچہ باشد نہان بہ طبع مریض　　　طبع تو مردرا نمودہ عیان

صاحب حکمتی بطبع درست　　　مومن صادقی و با ایمان

از برای شفا و راحت خلق　　　خلق کردہ ترا خدای جہان

حقہ ہای کہ ہست درپیشت　　　ہمہ پرگشتہ از مفرح جہان

چند قطعات میں خود اپنی خطاطی اور شاعری کی تعریف ہے، ایک قطعے میں اپنے پھوپھی زاد بھائی میر شریف کی تاریخ[1] وفات ہے، ایک قطعہ میں دیوان[2] حافظ کا ذکر ہے، ایک قطعہ خود اپنی مثنوی "نسخۂ مہر و وفا" کی تاریخ پر[3] ہے، ایک قطعہ دو شعری میں میر علی کے کمال کا ذکر اس طرح[4] کیا ہے:

[1] نسخۂ دیوان سالار جنگ میوزیم حیدر آباد ورق ۱۷۶و۔ تاریخ ۱۰۵۴۔ "خوشنویسی بود" سے نکلتی ہے [2] ایضاً ۱۷۵ اب تین بیتی قطعہ اسطرح شروع ہوتا ہے: "چون حافظ کس برون نامد ز شیراز مگر سعدی کہ استاد جہان است"۔ [3] ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ ورق ۴، اب "نسخۂ مہر و وفا" تاریخ ہے جس سے ۱۰۵۳ ہجری تاریخ نکلتی ہے [4] ورق ۱۷۲ اب۔

مرقعی کہ درو نیست خط میر علی   چو مجلس است کہ بی یار خوش لقا ہیچ است

خلی کہ نیست درو ہیچ مہرۂ زا صول   اگر ہزار کنی خدشۂ طلا ہیچ است

مثنویات :۔ عرشی کی تین مثنویاں موجود ہیں، ان میں سے ایک بطرز ساقی نامہ ہے اور کلیات کے[1] کلکتہ کے نسخے میں شامل ہے، دوسری مثنوی شاہد عرشی ہے، جو کلیات کے نسخے[2] کے علاوہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے کتابخانے[3] میں موجود ہے اور تیسری نسخۂ مہر و وفا کے نام سے کلکتہ کے نسخے میں موجود ہے، یہ مثنوی بھی عارفانہ رنگ میں ہے، راقم الحروف ساقی نامہ[4] اور نسخہ مہر و وفا سے ہنوز استفادہ نہیں کر سکا ہے، البتہ شاہد عرشی اس کے مطالعے میں ہے جس کی کسی قدر تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

مثنوی شاہد عرشی ۱۰۶۹ھ[5] میں مکمل ہوئی، مختصر مقدمے، حمد، مناجات، منقبتِ امام حسنؑ، منقبت امام حسینؑ کے بعد سبب نظم کے ذیل میں لکھتا ہے :

از شبی گویم کہ خورشید و قمر   بود در بزمش چو شمعی جلوہ گر

آمد الہامی بدل از ملک غیب   کہ مبرا لوح تو از حرف عیب

تا بکی در بند کثرت ماندۂ   دور از انوار وحدت ماندۂ

مثنوی در صفت حق آغاز کن   ناہدان را مطلع بر راز کن

لہ فہرست مخطوطات فارسی ایوانف مخطوط نمبر ۱۷۹، ورق ۲۲۴ ب سلہ ورق ۱۷۰ ب سلہ یونیورسٹی فارسی ۱۔۷۸۔۲ اوراق ۱۰۸، سطور ۱۹، خط نستعلیق بدون تاریخ سلہ فہرست مخطوطات، مخطوطہ شمارہ ۱۷۹، ورق ۱۲۴ ب سلہ شاہد عرشی بود جمال کمال تاریخ ہے جس سے سنہ ۱۰۶۹ھ نکلتا ہے۔ (نسخۂ شاہد عرشی، علی گڑھ، ورق ۵ الف)

عالم افسردہ اندر جوش آر   شاہد اسرار در آغوش آر

از سر تو تازہ کن باغ کہن   سر فروزان شمع وحدت از سخن

لطف معنی در اشارت آمدہ   در اشارت صد بشارت آمدہ

(ورق ۹ ب)

ظہور انوار عشق کے ذیل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

این سخن نوریست از خورشید جان   این سخن آمد فرود از آسمان

این سخن از داستان دیگر ست   این سخن گو از جہان دیگر است

جلوہ گاہ این سخن عرش برین   منزل این رحمۃ للعالمین

عشق و شوق کا بیان :

عشق را یک گام بر عرش استواست   گام دیگر من نمی دانم کجا ست

عشق را عالم بود مانند تن   آسمان بر قامتش یک پیرہن

عشق می گوید کہ مجنون بودہ ام   در جہان دل جگر خون بودہ ام

عشق می گوید زلیخا از من است   عشق می گوید کہ سودا از من است

عشق می گوید کہ یوسف من بدم   چون زلیخا خود بخود عاشق شدم

عشق می گوید کہ سبحان از من است   عشق می گوید کہ قرآن از منست

عشق می گوید محمد آمدم   آفتاب بخت سرمد آمدم

عشق می گوید ظہورم مرتضیٰ است   لافتی و ہل اتی وا نما ست

عشق می گوید کہ عیسیٰ آمدم   عشق می گوید کہ موسیٰ آمدم

خود بخود بر خود تجلی کردہ ام   جان عاشق را تسلی کردہ ام

خود بخود زلف پریشان خودم   خود بخود کفر خود ایمان خودم

مرحبا ای عرشی شیرین کلام — مرحبا ای سید عالی مقام
خوش بالہام سخن گویا شدی — حمد گوی عالم الاسما شدی
شوق افروزد دولت را چون چراغ — شوق بنماید ز حق در تو سراغ
شوق بنماید ترا رہ اندرون — شوق بنماید ترا حسن بطون
شوق در لحمہ برد بر اوج عرش — عرش را سازد براہت ہمچو فرش
شوق افروزد چراغ جان تو — شوق آراید رخ ایمان تو
شوق سازد قالبت را گلشنی — دل در و سازد چراغ روشنی

ورق ۱۳-۱۷ ب

اھل ظاھر و اھل باطن کا بیان :-

اہل ظاہر جملہ در آب و گل اند — اہل باطن جملہ در قید دل اند
اہل ظاہر زین سخنہا بی خبر — جملہ در آخور غفلت ہمچو خر
اہل ظاہر گنج و خود مار خود اند — خود بخود در سینہ آزار خود اند
اہل ظاہر از خدا بیگانہ اند — سر بسر در قید آب و دانہ اند
اہل ظاہر جملہ تن پرور بوند — سر بسر چوں کار خود ابتر بوند
اہل ظاہر را بود شیطان ندیم — می نماید راہ را سوی جحیم
اہل ظاہر جملہ غرق غفلت اند — یکسرہ افگندہ سر در خجلت اند
اہل ظاہر جملہ نفسانی بوند — اہل باطن جملہ روحانی بوند
اہل باطن را بود سیر بطون — اہل ظاہر را بود سیر برون
اہل باطن سر بسر چون آفتاب — خود بخود از جلوۂ خود کامیاب
اہل باطن جنت حق آمدند — شاہباز اوج مطلق آمدند

اہل باطن زمزمہ آرای جان — نغمہ زن در مجلس روحانیان
شامہ شان مست بوی کبریا — چشم شان حیران روی کبریا
جان ایشان از تجلی حضور — سر بسر ریزد بدل نور سرور
گوش شان مست کلام معنوی — جوش زن چون مولوی در مثنوی

(ورق ۱۸ ابجد)

حدیث حضرت رسول اکرمؐ : المجاز قنطرۃ الحقیقۃ کے تحت پھر عشق کا بیان ہے :

عشق ظاہر رہنمای باطنست — عشق ظاہر روی افزای تن است
عشق ظاہر چشمۂ فیض و سخاست — رہنما تا بارگاہ کبریا ست
عشق ظاہر مردہ دل زندہ کند — چون مسیح و خضر پایندہ کند
عشق ظاہر زینت باغ درون ست — خضر آسا تا بہ یزدان رہنمون ست
عشق ظاہر صیقل مرآت جانست — عشق ظاہر آبروی عاشقانست
عشق ظاہر عین آب زندگیست — نور شمع محفل پایندگیست
عشق ظاہر خسرو ملک بقاست — عشق ظاہر عین عشق کبریاست

(ورق ۲۶ و)

حدیث رسول اکرم : الفقر فخری کے تحت فقر کا بیان دیکھیے :

گفت پیغمبر کہ شان انس و جانست — زیب بخش باغ و بستان جانست
فخر من فقر آمد از لطف خدا — بین چہ فرمودہ ست آن خیر الوری
فقر گلزار جہان عزت است — فقر روشن ساز شمع رحمت است
فقر شمع محفل روحانیانست — ماہ شب افروز بزم عاشقانست
فقر گلزار طریقت آمدہ — نور خورشید حقیقت آمدہ
فقر خورشید جہان معنویست — فقر زیب بوستان معنویست

فقر عنوان کتاب رازجانست　　شرح متن مصحف آزادگانست

فقر خضر راه عاشق آمده　　جلوه گر در جان صادق آمده

فقر روشن ساز انوار دلست　　فقر آگه ساز اسرار دست

اہل فقر از فقر شاہی می کنند　　خضر آسا رہنمائی می کنند

اہل فقر از بند تن آزاده اند　　آستین بر ہر دو کون افشانده اند

(ورق ۱۳۵و)

(۱۳۶و)　　توکل تاج آرای مسند نشین تجمل است

بر توکل گر دلت شد مستقیم　　نعمت الوان رسانیدت نعیم

(ورق ۱۴۱ب)　　تفضیل عشق بر عقل معاد و تفضیل معاد بر عقل معاش

علم عشق اندر کتاب عقل نیست　　در کتاب عشق باب عقل نیست

(۱۶۲ب)　　آیۃ [1] = قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی الخ

[آپ ان سے یوں کہیے کہ میں تم سے کچھ مطلب نہیں چاہتا بجز رشتہ داری کی محبت کے۔]

اس کے تحت لکھتے ہیں:

جمله گفتندش که ای خیر البشر　　از ذوی القربای خود بر ده خبر

گفت اول مرتضی را بنگرید　　بعد از و پس فاطمه را بشمرید

پس حسن و انگه حسین است ای بہان　　حُبّ ایشان فرض شد بر امتان

ہر که دارد دوست ایشان را ز دل　　او برون آرد دل خود ز آب و گل

حب ایشان مایۂ ایمان بود　　اہل دین را حجت و برہان بود

حب ایشان مژدهٔ جنت بود　　بر سر دل افسر رحمت بود

---

[1] قرآن سورہ ۴۲ آیت ۲۳۔

حب ایشان صدر جنت سازدت　　پس لوای معرفت افرازدت

(۱۶۳و)　　آیۃ [1] = يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا الخ کے ذیل میں یہ اشعار ملتے ہیں:

ای که ایمان با خدا آورده اید　　از ہمه سوره بیک سو کرده اید

آنزمان ایمان تان گردد قبول　　رو نہید از راه دل سوی رسول

ہست این ایمان اول ای فتی　　اینچنین آمد خبر ز اوج سما

دوستی اہل بیت مصطفےٰ　　بر تو آمد فرض از حکم خدا

(۱۶۵و)　　امیر المومنین علی کی منقبت اور رویت ذوالجلال کا بیان:

چون محمد گوئی از صدق و صفا　　دلنشین آید علی گفتن ترا

مولوی خوش گفته در مدح علی　　افتخار ہر نبی و ہر ولی

مصرعۂ موزون بمدح بوتراب　　ہست افزون تر ز صد باب کتاب

ہر ولی کز حب او باشد تہی　　او نمی بیند دگر روز بہی

بی ولای او ولی نتوان شدن　　عارف حق جز علی نتوان شدن

پھر رویت کا بیان ہے:

(۶۵ب)　　بشنو از من حال رویت را عیان　　دل مکن از جہل غفلت تیره دان

ذات پاکش از جہت گرچه برون ست　　تازه از فیض درون و ہم برونست

طالبی کو از جہت آید برون　　سیر آرد بی جہت در اندرون

بی جہت بیند جمال کبریا　　می شود چشم دگر از جانش وا

---

[1] قرآن سورہ ۴ آیت ۱۳۶ ترجمہ آیت کا یہ ہے۔ اے ایمان والو تم اعتقاد رکھو اللہ کے ساتھ اور اسکے رسول کے ساتھ اور اس کتاب کے ساتھ جو اس نے اپنے رسول پر نازل فرمائی اور ان کتابوں کے ساتھ جو کہ پہلے نازل ہو چکی ہیں۔

(ورق ۷ ب) فرید الدین گنج شکر کی کرامات نقل کی ہے۔ جو مولانا روم کی مدح پر ختم ہوتی ہے۔

بود سیاح جہان معنوی — سیر او از خلق بوده منزوی

در ہوای سیر شد شہباز جان — شد گذر او را بہ شہر مولتان

رفت اندر خانقاہ شیخ شہر — کہ بہاء الدین است نام او بدہر

خوش نشستہ بود پیر شیخ و شاب — بر سر کرسی چو بر چرخ آفتاب

شد مقابل با بہاء الدین فرید — آن ہمارا این ہما بر سر رسید

گفت پیر مولتان ای شاہ باز — تا کجا کارت رسیدہ گوی راز

گفت مخدوما برین کرسی کہ ہست — جای تو چون پادشہ داری نشست

گر بگویم می شود اندر ہوا — از زمین خیزد نشیند بر ہوا

این نگفتہ بود کان کرسی زجا — رفت و شد با پیر ملتان بر ہوا

زد بکرسی پیر ملتان باز دست — از ہوا کرسی بجای خود نشست...

عارفان دانند اسرار درون — عارفان فہمند رمز اندرون

عارفان دانند رمز از کجاست — عارفان دانند کاین سر خداست

عارفان مستند در بزم درون — ساقی ایشان است معشوق بطون

گوش شان مست از کلام معنوی — زین سخن آگاہ باشد مولوی

مولوی در مثنوی استاد من — کرد از فیض سخن ارشاد من

نیک گفت از ذوق جان بابای من — روشنی افزای شمع رای من

مولوی را شاعر ماضی مدان — آفتاب جان شناس و جان جان

مولوی آئینہ ذات خداست — خود بخود بینای نور کبریاست

خوش بگفت آنکس بشعر انتخاب — نیست پیغمبر ولی دارد کتاب

مولوی را معنوی شد قافیہ — معنوی را مولوی شد قافیہ...

مثنوی شاہد عرشی میں شاعر نے اپنے اجداد اور خاندان کے بعض افراد کے بارے میں بہت مفید معلومات فراہم کی ہیں۔ ان میں شاہ طیب ہیں (جو بقول میر صالح کشفی ماں کی طرف سے چوتھے جد تھے) شاہ نعمت اللہ ولی، مظہر الآثار، سید ہاشمی، عبداللہ ترمذی ص ۶۶ اور بھائی میر صالح بیٹے محمد عارف ہیں۔ شاہ طیب کا بیان کئی حکایتوں[1] کے ضمن میں ہوا ہے، شاہ نعمت اللہ ولی اور سید ہاشمی کا ذکر ایک ایک بار بیٹے کی نصیحت کے ضمن میں اور عبداللہ ترمذی کے لیے ایک بڑی داستان[2] کے علاوہ ایک آدھ جگہ اور ذکر آیا ہے[3] میر صالح کشفی کی مدح میں ایک باب ہے اور بیٹے کی نصیحت[4] میں خاندان کے مختلف افراد کا ضمنی ذکر آ گیا ہے۔

شاہد عرشی کے خاتمہ میں میر مومن عرشی نے اپنے شاعرانہ نقطۂ نظر کے ساتھ اس مثنوی کے اغراض و خصوصیات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ چند اشعار نقل ہو چکے، چند اشعار اور نقل کیے جاتے ہیں:

شکر آرایم کہ از گلزار ناز — شاہد آوردم در آغوش نیاز

شکر آرایم کہ از بستان غیب — مثنوی کردم برون چو گل ز جیب

شست و شوی لب دہم از شکر لب — کہ کتاب معنوی خواندم سبق

چون دل من شکر را در بر کشید — شاہد عرشی در آغوشم کشید

شاہدی چہرہ رشک آفتاب — خود بخود از جلوۂ خود کامیاب

شاہدی کو را مکان در لامکانست — حال او بیرون ز تقریر و بیانست

۱؎ ۳۵ ب، نصیحت پسر ورق ۱۰۷، ۷۷ و ۲؎ ورق ۶۶ ب، ورق ۴۲ و ۳؎ ۶۸، ۶۸ ب ۴؎ ۷۰-۷۷ ب۔

شاہد عرشی ست در آغوش من | مست گشت از عطر زلفش ہوش من
شاہد عرشی ندارد ہیچ عیب | یافتہ آرایش از تزئین غیب

اسکے بعد اپنے کو دوسرے شاعروں سے اس لحاظ سے ممتاز کیا ہے کہ دوسرے شعرا امرا اور شاہان کی مدح کرتے ہیں اور انکے مقاصد دنیاوی اغراض پر محمول ہوتے ہیں لیکن عرشی شاعر رحمان ہے، وہ مولوی معنوی کا مقلد اور انکے طرز کا پیرو ہے، آخر میں شاہد عرشی کا امتیاز چند اشعار میں اس طرح بیان کیا ہے:

شاہد عرشی است نام این کتاب | می شود از بابہایش فتح یاب
معنی این مثنوی فہمد دلی | کز محبت کردہ باشد حاصلی
آنچہ با من گفت دل من گفتہ ام | گوہر راز حقیقت سفتہ ام
ہر کسی کز صدق خواند این کتاب | گردد از راز حقیقت بہرہ یاب
خواہم از لطف خداوند کریم | باسط و باری و غفار و رحیم
تا کند مقبول طبع خاص و عام | این کتاب مثنوی را والسلام ۹۸۵

یہ مقالہ اکبرآباد میں مقیم ترمذی سادات کے خاندان پر جسکے سب سے ممتاز رکن میر عبداللہ مشکین قلم (م: ۱۰۳۵) تھے تیسرا مقالہ ہے پچھلے دو مقالے بالترتیب مشکین قلم (معارف اپریل ۱۹۹۱) اور میر صالح کشفی (مجلہ علوم اسلامیہ علیگڑھ ج ۱۶ نمبر ۲۰۱) پر شایع کیے جا چکے ہیں اس خاندان کے دو ایک فرد کا نام اس مقالے میں آیا ہے، کوشش ہو تو بخوبی ممکن ہے کہ انکے کارنامے سامنے آجائیں اس خاندان سے متعلق ایک قلمی رسالہ انڈین کاونسل آف کلچرل ریلیشن کے کتب خانے میں ہے لیکن وہ نہ مل سکا، مل جاتا تو یقیناً کچھ اور مفید اطلاعات بہم پہنچتیں۔ اگرچہ کہ نہ جانے کتنے علمی خانوادے ہماری توجہ کے محتاج ہیں ہمارے محققین و مورخین کا فرض ہے کہ ان علمی خانوادوں کو اپنی تحقیق کا موضوع بنائیں، اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو تاریخ ہماری اس کوتاہی کو معاف نہیں کرے گی۔

کلمات نقشبندیہ

از ڈاکٹر سید غیاث الدین محمد عبدالقادر ندوی

اسلامی تصوف کا سلسلہ عالیہ نقشبندیہ حضرت خواجہ بہاء الحق والدین محمد بن محمد البخاری معروف بہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ (ولادت ۷۱۸ھ وفات دوشنبہ ۳ ربیع الاول ۷۹۱ھ/۱۳۹۰ء) کی نسبت سے "نقشبندی" سلسلہ کہلاتا ہے۔[1] ہندوستان میں اس سلسلہ کی مستحکم بنیاد حضرت خواجہ محمد رضی الدین عبدالباقی باقی باللہ بیرنگ (ولادت ۵ ذی الحجہ ۹۷۱ھ/۱۵ جولائی ۱۵۶۴ء بمقام کابل وفات ۱۰۱۲ھ/۳ دسمبر ۱۶۰۳ء بمقام دہلی) نے رکھی۔ حضرت مجدد الف ثانی اور حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی جیسے آپ کے خلفائے کبار کے علاوہ آپ کے صاحبزادگان حضرت خواجہ محمد عبیداللہ معروف بہ خواجہ کلاں اور حضرت خواجہ محمد عبداللہ معروف بہ خواجہ خورد اور چند دیگر خلفائے شیخ تاج الدین سنبھلی، شیخ الہ داد، خواجہ محمد نور، مرزا حسام الدین احمد وغیرہم رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کے واسطوں سے آپ کا سلسلۂ طریقت عام ہوا اور مقبولیت تمام سے سرفراز ہوا۔[2]

اس سلسلہ عالیہ کی ظاہری خصوصیت تو یہ ہے کہ یہ سیدنا حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر تمام ہو کر واصل بہ ذات رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم ہوتا ہے جبکہ دیگر سلاسل سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ تعالیٰ وجہہ پر تمام ہوتے ہیں۔ سلسلۂ نقشبندیہ

مرفوع ہے جبکہ خواجہ حسن بصریؒ کے واسطے سے جو سلاسل مذکور ہیں وہ مرسل ہیں اسلیے کہ خواجہ حسن بصریؒ کی ملاقات حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ تعالیٰ وجہہ سے ثابت نہیں ہے۔

علامہ عبدالرحمٰن جامیؒ نے نفحات الانسؒ میں خواجہ نقشبندؒ کے مندرجہ ذیل اقوال نقل فرمائے ہیں جن سے اس سلسلہ عالیہ کی خصوصیات معلوم ہوتی ہیں۔

(۱) پرسیدند کہ در طریقۂ شما ذکر جہر و خلوت و سماع می باشد فرمودند کہ نمی باشد

لوگوں نے دریافت کیا کہ آپ کے طریقہ میں ذکر جہری، خلوت اور سماع ہے؟ فرمایا کہ نہیں ہے۔

(۲) گفت کہ بنا ر طریقۂ شما بر چیست؟ فرمودند کہ خلوت در انجمن بظاہر با خلق ہستند و بباطن با حق سبحانہ و تعالیٰ

عرض کیا کہ آپ کے طریقہ کی بنا کیا ہے فرمایا کہ خلوت در انجمن بظاہر مخلوق کے ساتھ رہے اور بباطن حق سبحانہٗ و تعالیٰ کے ساتھ۔

(۳) اہل حقیقت ایمان را چنیں تعریف کردہ اند کہ الایمان عقد القلب بنفی جمیع ما تولعت القلوب من المنافع والمضار سوی اللہ تعالیٰ و می فرمودہ اند طریقۂ ما صحبت است و در خلوت شہرت است و در شہرت آفت است خیریت در جمعیت است و جمعیت در صحبت بشرط نفی بودہ۔

اہل حقیقت نے ایمان کی تعریف یوں کی ہے کہ ایمان نام ہے قلب کو مضبوط کر لینے کا اللہ تعالیٰ کے علاوہ تمام نفع بخش اور ضرر رساں ذرائع کی نفی پر جنکی طرف دل بھٹک جاتے ہیں نیز فرمایا کہ ہمارا طریقہ صحبت ہے اور خلوت میں شہرت ہے اور شہرت میں آفت ہے، خیریت جمعیت میں ہے اور جمعیت صحبت میں بشرط نفی ہوتی ہے۔

(۴) در ہمہ احوال قدم بر جادۂ امر و نہی و عمل بعزیمت و سنت بجائے آری و از رخصتہا و بدعتہا دور باشی و دائما احادیث مصطفیٰؐ را پیشوائے خود سازی و متفحص و متجسس اخبار و آثار رسولؐ و صحابۂ کرامؓ باشی۔

ہر حال میں امر و نہی کی راہ پر قدم جمائے رہے اور عزیمت و سنت پر عمل کرتا رہے، رخصتوں اور بدعتوں سے دور رہے اور ہمیشہ احادیث مصطفیٰؐ کو اپنا پیشوا بنائے رہے اور اخبار و آثار رسولؐ و صحابہؓ کی تلاش و جستجو میں فکر مند رہے۔

اس سلسلہ کی خصوصیت شیخ محمد اکرام مرحوم نے "رود کوثر" میں اس طرح بیان کی ہے۔

"عہد اکبری میں علماء و مشائخ کی کمی نہ تھی۔ مورخین عہد نے ان کی جو طویل فہرستیں دی ہیں ان سے خیال ہوتا ہے کہ اس دور کو علم اور تصوف کا عہد زریں سمجھنا چاہیے۔ لیکن عام طور پر ان بزرگوں نے عہد اکبری کی مذہبی بوالعجبیوں کو روکنے کے لیے کوئی مؤثر کوشش نہ کی۔ ان میں سے جو غالی وحدت الوجودی خیالات کے تھے (مثلاً شیخ امان پانی پتی کے قبیلہ والے) وہ تو اکبر کی مذہبی اختراعوں میں اس کے شریک کار ہو گئے، جو شیخ عبدالحق محدث کی طرح ان اختراعوں سے متنفر تھے وہ دربار سے کنارہ کش رہے اور گوشۂ تنہائی میں اللہ اللہ یا درس و تدریس کرنے لگے، مخدوم الملک اور شیخ عبدالنبی صدر الصدور کو آپس کی مخالفتوں اور دوسری کمزوریوں نے بے اثر کر دیا تھا، جونپور کے ملا محمد یزدیؒ اور پنجاب کے علما اکبر کی تعزیری کوششوں کا شکار ہو گئے، فتنہ کا سد باب اور حالات کی اصلاح کسی سے نہ ہو سکی۔ دربار اکبری کے مذہبی رجحانات کے خلاف مستحکم محاذ ایک ایسے بزرگ نے قائم کیا جنھوں نے حصول فیض اور ارشاد

وہدایت کے لیے ایک زمانہ ہندوستان میں گزارا تھا، لیکن وہ پھر ماوراءالنہر گئے اور نقشبندیہ سلسلہ میں منسلک ہونے کے بعد عہد اکبری کے آخر میں دوبارہ ہندوستان آئے۔ اس کے بعد انہیں چار پانچ سال سے زیادہ کام کرنا نصیب نہیں ہوا لیکن اپنی روحانی پاکیزگی اور سربلندی سے انھوں نے اکبر کے اراکین سلطنت (مثلاً شیخ فرید، قلیچ خاں، صدر جہاں) اور علماء و مشائخ (مثلاً حضرت مجدد الف ثانیؒ، شیخ عبدالحق محدثؒ) کو اس طرح مسخر کیا اور بالجملہ ملک میں اسلامی روحانیت کی ایک ایسی زبردست لہر دوڑا دی اور (اکبر کی براہ راست مخالفت کیے بغیر) اس طرح ایک نئی زندگی کا آغاز کیا کہ اس فضا میں اکبری رجحانات کا فروغ پانا ناممکن ہوگیا۔"

"خواجہ باقی باللہؒ کا طریق کار وقت کی ضرورت کے لیے خاص طور پر موزوں تھا، عام طور پر ہمارے اہل اللہ ارباب اقتدار سے الگ تھلگ رہے، چشتی، سہروردی، قادری سلسلوں کی تمام روایات گوشۂ تنہائی میں یادِ خدا کرنے کی ہیں۔ لیکن اسوقت دربارِ شاہی سے بدعت و تجدد کی لہریں آ رہی تھیں اور اگرچہ ان سے عوام پر کوئی اثر نہ ہوا تھا بعض درباریوں کے طور طریقے بگڑ گئے تھے اسوقت ضرورت اس امر کی تھی کہ ارباب فیض دربارِ شاہی اور ارباب اقتدار سے الگ تھلگ رہنے کی بجائے ان سے ربط و ضبط پیدا کریں اور ان خرابیوں کی اصلاح کریں جو اکبر کی مذہبی اور معاشی بدعتوں نے پیدا کر دی تھیں۔ صوفیہ میں اس طریقۂ کار کے سب سے پُرزور ترجمان نقشبندی حضرات ہیں، جن کے ایک مشہور بزرگ خواجہ عبیداللہ احرارؒ کا ایک قول حضرت مجدد الف ثانیؒ

کے کئی مکتوبات میں نقل ہوا ہے"۔

"اگر ما شیخی می کردیم، دریں روزگار ہیچ شیخ مرید نیافت، لیکن ما را کار دیگر فرمودہ اند کہ مسلمانان را از شر ظلم نگاہداریم، بواسطۂ ایں بباد شاہاں بالیست اختلاط کردن و نفوس ایشاں را مسخر گردانیدن و بتوسط ایں عمل مقصود مسلمین برآوردن"۔[۵]

"ہندوستان میں جس بزرگ نے اس اصول پر سب سے پہلے کثرت سے عمل کیا اور نہ صرف ہندوستان میں نقشبندی سلسلہ کی مستحکم بنیاد رکھی بلکہ امراء و اکابر سے اختلاط پیدا کر کے نہایت خاموشی سے درباری بدعتوں کے خلاف متشرع اور دیندار افراد کا محاذ قائم کیا وہ حضرت باقی باللہ بیرنگ تھے۔ جنھیں حضرت خواجہ عبیداللہ احرارؒ سے خاص طور پر تعلق خاطر تھا۔ انھوں نے سلسلۃ الاحرار کے نام سے جو رباعیات لکھی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے۔

ایں سکہ کہ من زدم، بنام فقر است — ویں روشنی از نور تمام فقر است

برخیز و رہِ خواجۂ احرار بگیر — کاں راہ ز سرحد مقام فقر است"۔

یہی خواجہ عبیداللہ احرار رحمہ اللہ (ولادت ۸۰۶ھ/۱۳۹۱ء وفات ۸۹۵ھ/۱۴۸۳ء) ہیں جن کے تعلق سے اقبالؒ نے حضرت مجددؒ کی بابت فرمایا ع

جس کے نفس گرم میں ہے گرمیٔ احرار

• شیخ محمد امین الکردی الاربلی الشافعی (وفات ۱۳۳۲ھ) نے اپنی کتاب "تنویر القلوب فی معاملۃ علام الغیوب"[۶] میں حضرت ابو سعید خرازؒ کا یہ قول نقل کیا ہے:

لیس الکامل من صدر	کامل وہ نہیں ہے جس سے طرح طرح کی
عنہ انواع الکرامات، وانما	کرامتوں کا ظہور ہو، کامل تو بس وہ
الکامل الذی یقعد بین الخلق	ہے جو مخلوق کے درمیان بیٹھے ان سے
یبیع ویشتری معھم ویتزوج	خرید و فروخت کرے اور لوگوں سے
ویختلط بالناس ولا یغفل	میل جول رکھے اور اللہ سے ایک پل
عن اللہ لحظة واحدة۔	بھی غافل نہ ہو۔

اتباع و احیائے سنت اور اجتناب از بدعت اس طریقہ کا امتیاز ہے، اس سلسلہ کے مشایخ احکام شریعت کے اس قدر پابند ہوتے تھے کہ چودہویں صدی کے اس سلسلہ کے امام اوریس زمان حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ (ولادت ۱۲۰۸ھ وفات ۱۳۱۳ھ) نے ارشاد فرمایا "غوث ہو یا قطب جو خلاف شرع کرے وہ کچھ بھی نہیں" ایک دوسرے موقعہ پر فرمایا "اتباع سنت ہی غوثیت اور قطبیت ہے۔"

حضرت گنج مرادآبادیؒ اذکار و اوراد میں بھی سنت کا لحاظ رکھتے تھے، ان کے خلیفہ مولانا سید محمد علی مونگیریؒ لکھتے ہیں: ایک مرتبہ حضرت قبلہؒ نے یہ دعا پڑھی:

اللّٰھم اغفرلی ذنبی ووسع	اے اللہ! میرے گناہ بخش دے اور
لی فی داری وبارک لی	میرے گھر کو میرے لیے کشادہ کر دے
فی رزقی۔	اور میری روزی میں برکت عطا فرما۔

اور ارشاد ہوا کہ "وضو کے اندر اسی دعا کا پڑھنا حدیث سے ثابت ہے اور کسی دعا کا پڑھنا حدیث میں نہیں آیا۔"

مولانا جذب و شوق میں جو اشعار پڑھا کرتے تھے ان میں سنائی کا یہ شعر بھی تھا:

سرمہ در چشم سنائی چوں سنان تیر باد   گر زمانے زندگی خواہد سنائی بے سنن

اس سلسلہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں ذکر جہری کے بجائے ذکر خفی سری قلبی کی تلقین کی گئی ہے اور سالک کو اپنی ذاتی تربیت پر زور دینے کی تاکید کی گئی ہے۔ ذکر قلبی کے سلسلے میں نقشبندی بزرگ شیخ محمد امین الکردیؒ تحریر فرماتے ہیں:

اعلم ان الذکر نوعان: قلبی و	جان لو کہ ذکر کی دو قسمیں ہیں: قلبی اور
لسانی ولکل واحد منھما	لسانی اور دونوں میں سے ہر ایک کے
شواھد من الکتاب والسنة	لیے کتاب و سنت کے شواہد موجود ہیں،
فالذکر اللسانی باللفظ المرکب	پس ذکر لسانی جو اصوات و حروف پر
من الاصوات والحروف لا	مشتمل الفاظ کے ذریعہ ہوتا ہے ذاکر
یتیسر للذاکر فی جمیع الاوقات	کے لیے جملہ اوقات میں آسان نہیں ہے
فان البیع والشراء ونحوھما	اس لیے کہ خرید و فروخت اور اس کے
یلھیان الذاکر عنہ البتة	جیسے اعمال ذاکر کو ذکر سے غافل کرتے
بخلاف الذکر القلبی فانہ بملاحظة	رہتے ہیں، برخلاف ذکر قلبی کے کہ وہ
مسمّی ذالک اللفظ المجرد عن	اس لفظ کے مسمّی کا دھیان کرکے ہوتا
الحروف والاصوات واذاً	ہے جو حروف و اصوات سے خالی ہوتا ہے
فلا شیٔ یلھی الذاکر عنہ	اور تب کوئی چیز ذاکر کو غافل نہیں کر سکتی۔
بقلب فاذکروا اللہ خفیا	خاموشی سے اللہ کا ذکر کرو مخلوق سے
عن الخلق بلا حرف وقال	بغیر حرف و قال کے ہٹ کر، یہ ذکر
وھذا الذکر افضل کل ذکر	تمام اذکار سے افضل ہے بزرگوں نے

لیس الکامل من صدر	کامل وہ نہیں ہے جس سے طرح طرح کی
عنہ انواع الکرامات، وانما	کرامتوں کا ظہور ہو، کامل تو بس وہ
الکامل الذی یقعد بین الخلق	ہے جو مخلوق کے درمیان بیٹھے ان سے
یبیع ویشتری معھم ویتزوج	خرید و فروخت کرے اور لوگوں سے
ویختلط بالناس ولا یغفل	میل جول رکھے اور اللہ سے ایک پل
عن اللہ لحظۃ واحدۃ۔	بھی غافل نہ ہو۔

اتباع و احیائے سنت اور اجتناب وردِ بدعت اس طریقہ کا امتیاز ہے، اس سلسلہ کے مشایخ احکام شریعت کے اس قدر پابند ہوتے تھے کہ چودہویں صدی کے اس سلسلہ کے امام اویس زماں حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ (ولادت ۱۲۰۸ھ وفات ۱۳۱۳ھ) نے ارشاد فرمایا: "غوث ہو یا قطب جو خلاف شرع کرے وہ کچھ بھی نہیں" ایک دوسرے موقعہ پر فرمایا "اتباع سنت ہی غوثیت او قطبیت ہے"

حضرت گنج مرادآبادیؒ اذکار و اوراد میں بھی سنت کا لحاظ رکھتے تھے، ان کے خلیفہ مولانا سید محمد علی مونگیریؒ لکھتے ہیں: ایک مرتبہ حضرت قبلہؒ نے یہ دعا پڑھی:

اللّٰھم اغفر لی ذنبی ووسع	اے اللہ! میرے گناہ بخش دے اور
لی فی داری وبارک لی	میرے گھر کو میرے لیے کشادہ کردے
فی رزقی۔	اور میری روزی میں برکت عطا فرما۔

اور ارشاد ہوا کہ "وضو کے اندر اسی دعا کا پڑھنا حدیث سے ثابت ہے اور کسی دعا کا پڑھنا حدیث میں نہیں آیا"۔

مولانا جذب و شوق میں جو اشعار پڑھا کرتے تھے ان میں سنائی کا یہ شعر بھی تھا۔

سرمہ در چشم سنائی چوں سنان تیر باد ۔۔۔ گر زمانے زندگی خواہد سنائی بے سنن

اس سلسلہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں ذکر جہری کے بجائے ذکر خفی سری قلبی کی تلقین کی گئی ہے اور سالک کو اپنی ذاتی تربیت پر زور دینے کی تاکید کی گئی ہے۔ ذکر قلبی کے سلسلے میں نقشبندی بزرگ شیخ محمد امین الکردیؒ تحریر فرماتے ہیں:

اعلم ان الذکر نوعان: قلبی و	جان لو کہ ذکر کی دو قسمیں ہیں: قلبی اور
لسانی ولکل واحد منھما	لسانی اور دونوں میں سے ہر ایک کے
شواھد من الکتاب والسنۃ	لیے کتاب و سنت کے شواہد موجود ہیں،
فالذکر اللسانی باللفظ المرکب	پس ذکر لسانی جو اصوات و حروف پر
من الاصوات والحروف لا	مشتمل الفاظ کے ذریعہ ہوتا ہے ذاکر
یتیسر للذاکر فی جمیع الاوقات	کے لیے جملہ اوقات میں آسان نہیں ہے
فان البیع والشراء ونحوھما	اس لیے کہ خرید و فروخت اور اس کے
یلھیان الذاکر عنہ البتۃ	جیسے افعال ذاکر کو ذکر سے غافل کرتے
بخلاف الذکر القلبی فانہ بملاحظۃ	رہتے ہیں، برخلاف ذکر قلبی کے کہ وہ
مسمّی ذالک اللفظ المجرد عن	اس لفظ کے مسمّی کا دھیان کر کے ہوتا
الحروف والاصوات واذاً	ہے جو حروف و اصوات سے خالی ہوتا ہے
فلا شیٔ یلھی الذاکر عنہ	اور تب کوئی چیز ذاکر کو غافل نہیں کر سکتی۔
بقلب فاذکروا اللہ خفیا	خاموشی سے اللہ کا ذکر کرو مخلوق سے
عن الخلق بلا حرف وقال	بغیر حرف و قال کے ہٹ کر، یہ ذکر
وھذا الذکر افضل کل ذکر	تمام اذکار سے افضل ہے بزرگوں نے

بمعناہ قد جری قول الرجال۔
ولذٰلک اختار ساداتنا
النقشبندیۃ الذکر القلبی
ولان القلب محل نظر اللّٰہ
الغفار وموضع الایمان ومعدن
الاسرار ومنبع الانوار وبصلاحہ
یصلح الجسد کلہ وبفسادہ
یفسد الجسد کلہ کما بینہ
لنا النبی المختار (صلی اللہ علیہ وسلم)
ولا یکون العبد مومنا الا
بعقد القلب علی ما یجب الایمان
بہ ولا تصح عبادۃ مقصودۃ
الا بنیۃ فیہ وقد اجمع
الائمۃ علی ان افعال الجوارح
لا تقبل الا بعمل القلب وان
عمل القلب یقبل بدونہا،
ولو لم تقبل اعمال القلوب لما
قبل الایمان لان الایمان
ھو التصدیق بالقلب۔

ایسی ہی بات فرمائی ہے۔
اور اسی لیے ہمارے نقشبندی بزرگوں
نے ذکر قلبی کو اختیار کیا ہے اور اسلیے بھی
کہ قلب اللہ غفار کی نظر کا مقام ہے،
ایمان کی جا ہے، اسرار کی کان اور
انوار کا سرچشمہ ہے، اسکی درستگی
پورے بدن کی درستگی کا باعث ہے
اور اسکے بگاڑ سے پورے بدن کا
بگاڑ ہے ایسا ہی ہم سے نبی مختار نے
بیان فرمایا ہے۔ اور نیت کے بغیر کوئی
عبادت درست نہیں۔ ائمہ کا اجماع
ہے کہ اعضاء و جوارح کے افعال عمل
قلب کے بغیر مقبول نہیں جب کہ
عمل قلب بغیر ان کے مقبول ہے،
اور اگر اعمال قلوب مقبول نہیں
تو ایمان مقبول نہیں اس لیے کہ
ایمان تصدیق بالقلب کا نام
ہے۔

اس سلسلہ میں شیخ صاحب موصوف کے مندرجہ ذیل فقرے بھی لائق ذکر ہیں:

واما السادۃ النقشبندیۃ فقد
قالوا: بعد ما یتوجہ المرید الی
التصفیۃ والتوجہ الی الحق بالصدق
یحصل لہ من التزکیۃ بامداد
جذبۃ من جذبات الرحمٰن فی
ساعۃ ما لا یحصل لغیرہ من الریاضات
فی سنین — فاول قدم یضعونہ
فی الذکر القلب وھو المرتبۃ الثانیۃ
من مراتب الذکر فی سائر الطرق —
— قال الشیخ الاکبر (السید محمد
بہاء الدین نقشبند) قدس سرہ
(بدایۃ طریقتنا نہایۃ سائر الطرق)
وھی طریقۃ الصحابۃ رضی اللہ عنہم
باقیۃ علی اصلہا لم یزیدوا ولم
ینقصوا۔

نقشبندی بزرگوں نے فرمایا ہے کہ
مرید جب صدق دل سے تصفیہ اور
توجہ الی الحق پر متوجہ ہوتا ہے تو اسکو
جذبہ رحمانی کی امداد سے جو تزکیہ ایک
گھڑی میں حاصل ہو جاتا ہے وہ دوسری
ریاضتوں سے برسوں میں نہیں حاصل
ہوتا — پس وہ پہلا قدم ذکر میں
قلب پر رکھتے ہیں حالانکہ دوسرے
تمام طریقوں میں مراتب ذکر کا دوسرا
مرتبہ ہے — شیخ اکبر سید محمد بہاء الدین
نقشبند قدس سرہ نے فرمایا (ہمارے
طریقہ کی ابتدا دوسرے تمام طریقوں کی
انتہا ہے) اور یہی صحابہ رضی اللہ عنہم
کا طریقہ ہے جو بے کم و کاست اپنی اصل
پر باقی ہے۔

اشغال نقشبندیہ | نقشبندیہ تین اشغال کی تلقین کرتے ہیں:

(۱) ذکر　(۲) مراقبہ　(۳) رابطہ بالشیخ۔

ذکر دو طرح کا ہے: نفی اثبات، اثبات مجرد۔

نفی اثبات | حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ اپنی کتاب "القول الجمیل" میں تحریر فرماتے ہیں:

قالوا: طرق الوصول الی اللہ
ثلاث احدھا: ذکرہ النفی والاثبات
وھو الماثور عن متقدمیھم
وصفتہ ان ینتھز فرصۃ من
التشویشات الخارجیۃ کالاستماع
الی احادیث الناس والداخلیۃ
کالجوع المفرط والغضب والالم
والشبع المفرط ثم یذکر الموت
ویحضرہ بین یدیہ ویستغفر اللہ
تعالیٰ مما صدر عنہ من المعاصی
ثم یغمض شفتیہ ویغمض عینیہ
ویحبس نفسہ فی بطنہ ویقول
بالقلب "لا" یخرجھا من سرتہ
الی الایمن ویمدھا حتی یصل
الی منکبہ ثم یحرک منکبہ الی
راسہ فیقول "اللہ" ثم یضرب
فی قلبہ بالشدۃ "الا اللہ" قالوا:
لحبس النفس خاصیۃ عجیبۃ

نقشبندیہ نے کہا کہ اللہ تک پہنچنے
کی تین راہیں ہیں (ایک تو ذکر ہے)
سو منجملہ ذکر کے نفی اور اثبات ہے
اور وہی منقول ہے متقدمین نقشبندیہ
سے اور طریقہ نفی اثبات کے ذکر کا
یہ ہے کہ فرصت کو غنیمت جانے
تشویشات بیرونی سے چنانچہ
لوگوں کی گفتگو سننا اور تشویشات
اندرونی سے چنانچہ گرسنگی زائد اور
غضب اور درد اور سیری مفرط پھر
موت کو یاد کرے اور تصور میں اسکو
اپنے آگے سامنے کرے اور اللہ تعالیٰ سے
مغفرت چاہے ان گناہوں کی جو اس سے
صادر ہوئے پھر دونوں لبوں اور
دونوں آنکھوں کو بند کرے اور
دم کو اپنے پیٹ میں حبس کرے اور
دل سے کہے "لا" اس کو اپنی ناف
سے داہنی طرف نکالے اور کھینچے یہاں تک

فی تسخین الباطن وجمع العزیمۃ
وھیجان العشق وقطع احادیث
النفس ویتدرج فی الحبس
لئلا یثقل علیہ، والمراد
بالحبس غیر المفرط فبینہ
وبین ما یأمر بہ الجوکیۃ
بون بائن وکذالک لعدد
الوتر خاصیۃ عجیبۃ فیقول
اولا ھذہ الکلمۃ مرۃ فی
نفس واحد ثم یقول
ثلث مرات فی نفس واحد
وھکذا یتدرج حتی یصل
الی احدی وعشرین مع المراعاۃ
علی عدد الوتر والشرط الاعظم
ملاحظۃ نفی المعبودیۃ
والمقصودیۃ او الوجود من
غیر اللہ تعالیٰ واثباتھا
لہ تعالیٰ علی وجہ التاکید
واجتماع الخاطر لا کمایدور

کہ اپنے مونڈھے تک پہونچے پھر مونڈھے
کو سر کی طرف جھکا دے اور ہلا دے
اور کہے "اللہ" پھر ضرب لگا دے اپنے
دل میں سختی سے "الا اللہ" کی نقشبندیہ
نے فرمایا کہ حبس نفس یعنی دم روکنے
کی عجیب خاصیت ہے باطن کے
گرم کر دینے اور جمعیت عزیمت
اور عشق کے ابھارنے اور
وساوس کے قطع کرنے میں اور
بتدریج اندک اندک حبس دم کی
مشق کرے تاکہ اس پر گراں نہ ہو
جاوے اور خشکی کی بیماری نہ پیدا ہو جاوے
اور حبس دم سے حبس غیر مفرط مراد ہے
جسکی نوبت حصر نفس تک نہ پہونچے تو
نقشبندیہ کے حبس دم میں اور اس حبس دم
میں جو جوگی بتاتے ہیں فرق بعید ہے اور
حبس دم کی مانند شمار طاق کی بھی عجیب
خاصیت ہے تو اول اس کلمۂ توحید کو
ایکبار ایک دم میں کہے، پھر تین بار ایک دم

فی النفس من الخطرات
والاحادیث ومن بلغ
الی احدی وعشرین مرۃ
ولم ینفتح له باب من الجذب
والانصراف الباطن
الی اللہ تعالیٰ وجب الاشتغال
باسمه والنفرۃ،
عن الاشتغال الاخری
فلیعرف ان عمله لم یقبل
فلیستأنف بحفظ الشروط
من الثلثة الی احدی
وعشرین۔

میں کہے اسی طرح درجہ بدرجہ چند روز
کی مشق میں اکیس بار تک پہونچے طاق عدد
کی مراعات کے ساتھ یعنی اول بار ایک بار
اور دوسری بار تین بار اور تیسری بار
پانچ بار اور چوتھی بار سات بار وعلیٰ ہذا
القیاس اور شرط اعظم نفی اثبات کے ذکر
میں ملاحظہ کرنا ہے نفی معبودیت یا نفی
مقصودیت یا نفی وجود کا غیر اللہ سے
اور اثبات معبودیت وغیرہ کا حق تعالیٰ
کے واسطے بروجہ تاکید اور اجتماع خاطر
نہ اوسطرح جیسے دل میں خطرات اور
باتوں کے خیالات گھومتے پھرتے ہیں
اور جو شخص کہ اکیس بار تک پہونچا اور
اسکے واسطے جذب یعنی کشش ربانی اور
خدا کی طرف گردش باطن کا دروازہ
نہ کھلا تو اسکو اسکے اسم کی مشغولی واجب
ہوئی اور نفرت اور اشتغال سے لازم
آئی تو چاہیے کہ وہ معلوم کرے کہ اسکا
عمل مقبول نہ ہوا تو شروط مذکورہ اسکو

پھر شروع کرنا چاہیے اکیس بار تک۔

شیخ محمد امین الکردی اس سلسلہ میں لکھتے ہیں:

وفی آخر کلمة التوحید عند الوقوف
علی عدد الوتر بتخییل (محمد رسول اللہ)
من القلب الی ما تحت الثدی الیمین
ویرید بذالك اتباع النبی صلی اللہ
علیه وسلم والمحبة له۔

عدد وتر پر پہونچ کر کلمۂ توحید کے آخر
میں قلب سے داہنی چھاتی کے نیچے تک
(محمد رسول اللہ ﷺ) کا خیال کرے
اور اس سے اتباع و محبت نبی صلی اللہ
علیہ وسلم کی نیت کرے۔

اثبات مجرد

شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں:

الاثبات المجرد کانه لم یکن
عند المتقدمین وانما استخرجه
خواجه محمد باقی او من
یقرب به فی الزمان واللہ
اعلم۔ وصفته ان یخرج
لفظة "اللہ" من سرته
بالشد التام ویمدھا حتیٰ
یصل الی ام دماغه مع الحبس
والتدریج فی الزیادۃ حتیٰ
ان منهم من یقولها فی نفس
واحد الف مرۃ۔

(اور منجملہ ذکر کے اثبات مجرد ہے یعنی فقط
اللہ کا ذکر کرے بدون نفی اور اثبات
وغیرہ کے اور گویا کہ یہ ذکر متقدمین
نقشبندیہ کے نزدیک نہ تھا اسکو تو
خواجہ محمد باقی یا انکے کسی قریب العصر
نے نکالا ہے۔ واللہ اعلم۔ اور طریقہ
اثبات مجرد کا یہ ہے کہ اللہ کے لفظ کو
اپنی ناف سے بشدت تمام نکالے اور
اسکو کھینچے یہانتک کہ دماغ کی جھلی تک
پہونچے حبس دم کے ساتھ اور اندک
اندک زیادہ کرتا جاوے یہانتک کہ

بعضے نقشبندی ایک دم میں اسکو
ہزار بار کہتے ہیں۔

اس ضمن میں مولانا بلھوریؒ نے یہ فائدہ نقل کیا ہے: "مولانا[۱۳] نے فرمایا کہ اثبات مجرد شریعت میں کہیں ثابت نہیں اس واسطے کہ ذات بحت کا تصور عوام کو ممکن نہیں بلکہ شرع میں اسم ذات بعض صفات یا بعض محامد کے ساتھ یا بعض ادعیہ کے ساتھ وارد ہوا ہے"۔

مراقبہ | شاہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

وثانیھا المراقبة، وصفتھا	اور دوسرا طریقہ وصول الی اللہ کا مراقبہ
ان یحبس النفس تحت	ہے اور طریقہ مراقبہ کا یہ ہے کہ دم کو بند
السرة حبساً یسیراً ثم یتوجه	کرے ناف کے نیچے تھوڑا سا پھر اپنے
بجمیع ادراکه الی المعنی المجرد	جمیع حواس مدرکہ سے متوجہ ہو معنی
البسیط الذی یتصور کل	مجرد بسیط کی طرف جس کو ہر شخص اللہ
احد عند اطلاق اسم الله	کے نام بولنے کے وقت تصور کرتا ہے
ولکن قل من یجرده عن	ولیکن ایسے لوگ کم تر ہیں جو اس معنی
اللفظ فلیجتهد هذا الطالب	بسیط کو لفظ سے خالی کر سکیں تو طالب
ان یجرد هذا المعنی عن الفاظ	کوشش کرے کہ اس معنی بسیط کو
ویتوجه الیه من غیر	الفاظ سے جدا کرے اور اسکی طرف
مزاحمة الخطرات والتوجه	متوجہ ہو بلا مزاحمت خطرات اور
الی الغیر ومن الناس من	التفات ماسوا اللہ کے اور بعضے
لا یمکنه هذا النحو من الادراك	لوگوں سے اس قسم کا ادراک نہیں

فمن المشائخ من یامره مثل هذا	ہو سکتا ہے سو بعضے مشائخ تو ایسے شخص
بالدعاء وصفته ان لا یزال	کو اس طرح کی دعا بتاتے ہیں اور طریقہ اس
یدعو الله بقلبه یقول:	دعا کا یہ ہے کہ ہمیشہ دل سے دعا کرے
یا رب انت مقصودی قد	یوں کہے کہ اے رب! تو ہی میرا مقصود
تبرأت الیك عن کل ما	ہے۔ میں بیزار ہو آیا تیری طرف تیرے
سواك ونحو ذالك من المناجاة	ماسوا سے اور مانند اسکے اور کوئی مناجات
ومنهم من یامره بتخییل الخلاء	کرے اور بعضے مشائخ شخص مذکور کو خلائے
المجرد او النور البسیط	مجرد یا نور بسیط کے خیال کرنے کو فرماتے
فیتدرج الطالب من هذا	ہیں تو طالب اس تخیل سے توجہ مذکور کی
التخییل الی التوجه المذکور۔	طرف بتدریج پہونچ جاتا ہے۔

مولانا بلھوریؒ اس مقام پر مزید لکھتے ہیں: "مترجم کہتا ہے خلاء مجرد سے یہ مراد ہے کہ سارے عالم کے مکان کو جمیع اجسام سے خالی تصور کرے اور نور بسیط سادہ روشنی سے عبارت ہے"۔

رابطہ بالشیخ | شاہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

وثالثها الرابطة بشیخه و	اور تیسرا طریقہ وصول الی اللہ کا رابطہ
شرطها ان یکون الشیخ	اور اعتقاد کامل بہم پہونچانا ہے اپنے
قوی التوجه دائم الیاد	مرشد کے ساتھ اور رابطہ مرشد کی
داشت فاذا صحبه خلی نفسه	شرط یہ ہے کہ مرشد قوی التوجہ
عن کل شیئ الا محبته وینتظر	ہو یادداشت کی بشق دائمی رکھتا ہو
لما یفیض منه ویغمض عینیه	پھر جب ایسے مرشد کی صحبت کرے تو

او یغمضهما وینظر بین عینی
الشیخ فاذا افاض شیئ فلیتبعه
بجامع قلبه ویحافظ علیه واذا
غاب الشیخ عنه یتخیل صورته
بین عینیه بوصف المحبة
والتعظیم فتفید صورته
ما تفید صحبته۔

اپنی ذات کو ہر چیز کے تصور اور خیال سے
خالی کر ڈالے سوا اسکی محبت کے اور اسکا
منتظر رہے جبکہ اسکی طرف سے فیض آوے
اور دونوں آنکھیں بند کر لے یا انکو کھول
دے اور مرشد کی دونوں آنکھوں کے
بیچ میں ٹکی لگاوے پھر جب کسی چیز کا فیض
آوے تو اسکے پیچھے پڑ جاوے اپنے دل کی
جمعیت سے اور چاہیے کہ اس فیض کی محافظت
کرے اور جب مرشد اسکے پاس نہ ہو تو
اسکی صورت کو اپنی دونوں آنکھوں کے
درمیان خیال کرتا رہے بطریق محبت
اور تعظیم کے تو اس کی خیالی صورت وہ
فائدہ دے گی جو اسکی صحبت فائدہ دیتی تھی

رابطہ بالشیخ کے سلسلے میں مولانا خرم علی بلہوری نے دو فوائد تحریر کیے ہیں:

(۱) "مولانا نے فرمایا حق یہ ہے کہ سب راہوں سے یہ راہ زیادہ تر قریب ہے، گاہے مرید میں قابلیت نہیں ہوتی تو اسکی مزید محبت سے مرشد اس میں تصرف کرتا ہے۔ مشائخ طریقت نے فرمایا ہے کہ اللہ کے ساتھ صحبت رکھو سو اگر تم سے نہ ہو سکے تو ان کے ساتھ صحبت رکھو جو اللہ کے ساتھ صحبت رکھتے ہیں اور اس آیت قرآنی میں کُونُوا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ (یعنی سچوں کے ساتھ رہو) ایک طرح کا اشارہ ہے رابطہ مرشد کا۔"

(۲) "مولانا نے فرمایا مرشد کی شرط یہ ہے کہ واصل بمقام مشاہدہ ہو اور نورانی بتجلیات ذاتیہ ہو جسکے دیکھنے سے ذکر کا فائدہ حاصل ہو بموجب اس حدیث کے کہ هم الذین اذا رأوا ذکر الله یعنی اولیاء اللہ وہ ہیں جنکے دیکھنے سے خدا یاد پڑے، اور جنکی صحبت فوائد صحبت کی مفید ہو بموجب اس حدیث کے کہ هم جلساء الله کہ اولیاء اللہ جلیس ہیں خدا کے، اور بمقتضائے اس حدیث معتمد کے کہ هم قوم لا یشقی جلیسهم اولیاء اللہ ایسی قوم ہیں جن کا جلیس اور ہم صحبت بدبخت نہیں ہوتا۔"

ان فوائد کے بعد مولانا بلہوری نے اپنی رائے ان الفاظ میں تحریر فرمائی ہے:

"خلاصہ یہ کہ جسکی صحبت سے دنیا سرد ہو اور ہر طرف سے دل ٹوٹ کر حضور حق سے متعلق ہو جاوے تو اسکی صحبت اور محبت اکسیر اعظم ہے اور جب دنیا دل سے نہ منقطع ہوئی تو تضیع اوقات ہے اسکی صحبت سے تو تنہائی بہتر ہے تو واجب ہے کہ غلو عوام سے دھوکا نہ کھاوے، ہر شخص سے بیعت نہ کرے بلکہ طریقت کی بیعت اس مرشد کامل مکمل سے کرے جسکی ولایت کی علامات ظاہر اور باہر ہوں۔ مولوی روم علیہ الرحمہ نے فرمایا ہے

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست پس بہر دستے نشاید داد دست

اعتقاد اور محبت مرشد کی عمدہ چیز ہے لیکن افراط اور تفریط ہر امر میں معیوب ہے ایسی افراط بھی بہتر نہیں جس میں صورت پرستی کی نوبت پہونچے اور شریعت محمدیہ کی مخالفت ہو جاوے حق تعالیٰ ہر امر میں صراط مستقیم پر قائم رکھے۔ آمین۔"

کلمات نقشبندیہ | یہ فارسی کے گیارہ کلمات ہیں۔ ان میں سے آٹھ یعنی ہوش در دم، نظر بر قدم، سفر در وطن، خلوت در انجمن، یاد کرد، بازگشت، نگاہ داشت، یادداشت حضرت خواجہ عبدالخالق غجدوانی سے ماثور ہیں اور باقی تین یعنی وقوف زمانی، وقوف قلبی، وقوف عددی

حضرت خواجہ نقشبندؒ سے ماثور ہیں ملا حسینؒ خبازؒ نے اول الذکر آٹھ کو ہشت شرائط نقشبند سے موسوم کیا ہے اور فارسی میں اس طرح نظم کیا ہے:

ہشت شرط است در رہ حق اے حسین	گر نگہ داری شوی فارغ از یں
ہوش در دم ہم نظر اندر قدم	خلوت در انجمن شد دم بدم
ہم سفر اندر وطن باید ہمے	یاد کرد و باز گشت در ہر دمے
پس نگاہ داشت باید یاد داشت	شغل داری صبح و شام و شب وچاشت

اس کے بعد ملا صاحب نے بشمول آخر الذکر تین کے ہر ایک کو مفصل بیان کرتے ہوئے انکے عام وخاص معانی بیان کیے ہیں، حضرت شاہ ولی اللہ نے القول الجمیل میں (ص ۵۷ تا ۶۴) اور شیخ محمد امین الکردیؒ نے تنویر القلوب (ص ۵۰۶ تا ۵۰۸) میں انکی تفصیل درج کی ہے۔ شیخ کردی نے شاہ صاحب اور ملا صاحب کے مقابلہ میں اختصار وجامعیت سے کام لیا ہے اسلیے ہم ہر ایک کی تفصیل ان ہی کے حوالہ سے نقل کریں گے اس کے بعد دیگر حضرات کے ضروری اضافات بھی شامل کر دیں گے۔

ہوش در دم | شیخ کردی فرماتے ہیں:

معناه حفظ النفس من الغفلة عند دخوله وخروجه وبينهما في جميع الانفاس لان كل نفس يدخل ويخرج بالحضور فهو حی موصول بالله وكل نفس يدخل ويخرج بالغفلة فهو ميت مقطوع عن الله۔	اس کے معنی یہ ہیں کہ دم کے آتے جاتے وقت اور اسکے درمیانی وقفہ میں تمام انفاس میں اسکی غفلت سے حفاظت کی جائے اسلیے کہ ہر سانس جو حضوری کے ساتھ آتی جاتی ہے وہ زندہ ہے اور واصل بحق سبحانہ ہے اور جو غفلت کے ساتھ آتی جاتی ہے وہ مردہ ہے اللہ سے کٹی ہوئی ہے۔

شاہ صاحبؒ نے اس کی وضاحت اس طرح فرمائی ہے:

معناه التيقظ في كل نفس فلا يزال متيقظا متفحصا عن نفسه في كل نفس هل هو غافل او ذاكر هذا طريق التدريج الى دوام الحضور وهذا للمبتدی فاذا توسط فی السلوک فليكن متفحصا عن نفسه فی كل طائفة من الزمان مثل ان يتامل بعد كل ساعة هل دخلت عليه فيها غفلة اولا فان دخلت غفلة استغفر وعزم على تركها فی المستقبل وهكذا حتى يصل الى الدوام ويسمى هذا الاخير بوقوف زمانی واستخرجه خواجه نقشبندؒ لما رای ان	ہوش در دم کے معنی ہوشیاری اور بیداری ہے ہر دم کے ساتھ، تو ہمیشہ بیدار اور متجسس رہے اپنی ذات سے، ہر سانس میں کہ وہ غافل ہے یا ذاکر اور یہ طریقہ ہے بتدریج دوام حضور کے حاصل کرنے کا اور اس طرح کی ہوشیاری مبتدی کے واسطے مخصوص ہے پھر جب آگے بڑھے اور سلوک کے درمیان میں آوے تو چاہیے کھوج کرتا رہے اپنی ذات کا تھوڑی مدت میں اس طرح کہ تامل کرے ہر ساعت کے بعد کہ اس ساعت میں غفلت آئی کہ نہیں سو اگر غفلت آگئی ہو تو استغفار کرے اور آئندہ کو اسکے چھوڑنے کا ارادہ کرے اسی طرح مدام تفحص کرتا رہے یہاں تک کہ دوام حضور کو پہونچ جاوے اور

التوجہ الی علم العلم فی کل نفس یشوش حال المتوسط فانما اللائق بہ الاستغراق فی التوجہ الی اللہ بحیث لا یزاحمہ علم ھذا التوجہ۔

یہ پچھلے طریق کی ہوشیاری مسمّی بہ وقوف زمانی ہے اسکو خواجہ نقشبندؒ نے استخراج کیا اس واسطے کہ انھوں نے معلوم کیا کہ متوجہ ہونا علم العلم کیطرف یعنی دانست کو دریافت کرنا ہردم میں سالک متوسط کے حال کو پریشان کرتا ہے اسکے مناسب تو استغراق ہے توجہ الی اللہ میں اس طرح پر کہ اسکو اپنے متوجہ ہونیکی دانست بھی مزاحم حال نہ ہو۔

یہاں مترجم مولانا بلھوریؒ نے یہ فائدہ درج کیا ہے:

"مترجم کہتا ہے ہر ہردم کا محاسبہ عبارت ہے ہوش دردم سے سو یہ مبتدی کے مناسب ہے نہ متوسط کے اور قدرے مدت کا محاسبہ جسکا نام وقوف زمانی ہے لائق بہ مرتبہ متوسط ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ وقوفِ زمانی کو صوفیہ محاسبہ کہتے ہیں۔ حدیث وارد ہے کہ ہوشیار وہ شخص ہے جس نے اپنے نفس کو دبایا اور مابعد موت کے واسطے عمل کیا اور امیر المومنین عمر فاروقؓ نے خطبہ میں فرمایا کہ اپنی جانوں کا محاسبہ کرو قبل اسکے کہ تم سے حساب لیا جاوے اور انکو وزن کرو قبل اسکے کہ وزن کیے جاؤ اور مستعد ہو جاؤ عرض اکبر کے واسطے یعنی خدا کا سامنا جو قیامت میں ہوگا اس دن تم سامنے کیے جاوگے تمہاری کوئی چیز نہ چھپ سکے گی۔"

ملا خبازؒ نے ہوش دردم کے عام معنی تو وہی لکھے جو اوپر مذکور ہوئے۔ صرف اتنا اضافہ ہے کہ "ہمیشہ ذکر میں مشغول رہے اور ربطِ قلب حاصل کرے۔" (بین السطور یعنی نور) اور خاص معنی یہ بتاسے کہ "ہر ایک دم میں غیر کی نفی اور حق کا اثبات کرے۔"

حواشی

۱؎ تفصیل کے لیے دیکھیے: انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس (۱۹۳۰) ۸: ۸۸۷، ایضاً ۱۰: ۲۶؛ نفحات الانس۔ عبدالرحمٰن جامی (نولکشور ۱۹۱۵): ۳۴۵ و مابعد؛ انوار العارفین۔ حافظ محمد حسین (۱۲۹۰ھ) ۲؎ تفصیل کے لیے دیکھیے: رودِ کوثر شیخ محمد اکرام (دہلی ۱۹۸۷ء): ۱۹۰ و مابعد ۳؎ ایضاً ص ۳۴۵ - ۳۴۶ ۴؎ ایضاً ص ۱۹۰ - ۱۹۱ ۵؎ ترجمہ: اگر ہم شیخی کرتے تو کوئی پیر مرید نہ پاتا لیکن ہم کو دوسرے کام کا حکم ہوا ہے کہ مسلمانوں کو ظلم کے شر سے محفوظ رکھیں اسکے لیے بادشاہوں سے ملنا جلنا اور انکے دلوں کو مسخر کرنا اور اس طرح مسلمانوں کے عمل مقصود کو حاصل کرنا ہوگا ۶؎ مطبوعہ مکتبہ اشاعت اسلام دہلی: ۵۰۵ ۷؎ تذکرہ حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ از: مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔ بار اول: ۵۰ ۸؎ ایضاً: ۵۲ ۹؎ مصدر سابق: ۵۰۸ - ۵۰۹ ۱۰؎ ایضاً: ۵۰۴ - ۵۰۵ ۱۱؎ مطبوعہ مع اردو ترجمہ مولانا خرم علی بلھوریؒ موسومہ بہ "شفاء العلیل" (مطبع محمدی ۱۳۲۹ھ): ۵۰ و مابعد عربی عبارت کا ترجمہ مولانا خرم علی صاحب ہی کا کیا ہوا ہے۔ آگے بھی شاہ صاحبؒ کی عبارتوں کے ترجمے انہی سے لیے گئے ہیں۔ ۱۲؎ مصدر سابق: ۱۴ ۱۳؎ مولانا بلھوری نے شفاء العلیل کے مقدمہ میں وضاحت کی ہے کہ "اور جو حواشی مصنف قدس سرہ اور انکے خلف الرشید علامہ عصر مسند دہر مولانا شاہ عبدالعزیزؒ کے اس کتاب پر صحیح پائے مزید توضیح اور تکثیر فوائد کے واسطے ان کا ترجمہ بھی ذیلی فوائد میں مندرج کر دیا۔ جہاں کہیں "مولانا" کا لفظ آوے تو مولانا شاہ عبدالعزیز مراد ہوں گے۔ ۱۴؎ سورۂ توبہ: آیت ۱۱۹ ۱۵؎ دیکھیے رسالہ ہشت شرائط مطبوعہ مع ترجمہ اردو از ملک فضل الدین ککی زئی۔ نولکشور۔ لاہور بار اول۔

(باقی)

غبارِ خاطر (ایک تاثراتی جائزہ)

از پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی

ایک محقق نے لکھا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد احمد نگر کے قید خانے میں کچھ ایسی باتیں لکھنا چاہتے تھے جن کا آپس میں کوئی مربوط سلسلہ نہ تھا: یہ کہ عین ممکن ہے کہ انہیں اس طرح کے مضامین لکھنے کا خیال فرانس کے مشہور مصنف مونٹسکیو کے فارسی خطوط (Persian Letters) کے مطالعے سے آیا ہو۔ فارسی خطوط کا ترجمہ کئی زبانوں میں ہوا تھا، عربی میں بھی ہوا تھا۔ اس بات کی تائید میں کوئی سند نہیں پیش کی گئی ہے کہ مولانا آزاد نے یہ عربی ترجمہ پڑھا ہوگا۔ فارسی اور اردو میں مکتوب نگاری کی شاندار روایت پہلے سے موجود تھی، جس سے مولانا آزاد واقف بھی ہوں گے اور متاثر بھی۔

مونٹسکیو کے فارسی خطوط میں کوئی غیر معمولی بات نہیں کہ اس سے مولانا آزاد جیسا عبقری جو زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنی راہ آپ نکالنے کا شیدائی تھا اس قدر متاثر ہو۔ یہ خطوط فارسی اس لیے ہیں کہ یہ خط و کتابت ہے چند ایرانیوں کے مابین جو یورپ کی سیاحت پر نکلے ہیں۔ یہ بھولے بھالے ایرانی سیاح مونٹسکیو کے ذہن کی پیداوار ہیں، ایک نئی طرز کی فکشن کے کردار جن کی زبان سے ان خطوط کا مصنف اٹھارویں صدی کے یورپ کی معیشت و معاشرت پر تنقید اور بعض روایتی اداروں پر طنز کرتا ہے۔ ان خطوط کا لہجہ اور ان کے موضوعات کا رنگ بالکل مختلف ہے۔ ہم نے اس کتاب کا انگریزی ترجمہ دیکھا تو محسوس ہوا کہ غبارِ خاطر اور اس میں کوئی مماثلت نہیں۔

غبارِ خاطر ایک دوسری نوعیت کی کتاب ہے۔ یہ بالکل واقعاتی نہیں ہے۔ اس کا لہجہ فارسی خطوط کے برخلاف سنجیدہ اور مفکرانہ ہے اور اس کی زبان اور اسلوب بیان میں علم و ادب کی فنکارانہ گھلاوٹ ہے جس کی وجہ سے مولانا آزاد کی یہ تصنیف اردو نثر میں ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ غبارِ خاطر کے خطوط، چند کو چھوڑ کر، نجی خط و کتابت کی نوعیت کے نہیں ہیں۔ انہیں جیل کی تنہائیوں میں مولانا آزاد نے اپنے سکونِ خاطر کے لیے لکھا ایسے متفرق عنوانات پر جو ان کے گہرے مطالعے اور مشاہدے کا موضوع تھے یا رہ چکے تھے۔ اور انھوں نے کچھ نتیجے نکالے تھے۔ شاید انہیں یہ خیال بھی ہو کہ جب کبھی یہ خطوط پڑھے جائیں گے تو پڑھنے والوں کو ان سے کچھ نہ کچھ بصیرت حاصل ہوگی اور غالباً اسی لیے انھوں نے اپنی عالمانہ دانشوری کی تابانیوں کو جستہ جستہ کر کے فکر و نظر کی راہوں میں بکھیر دینا چاہا ہوگا۔

قلعۂ احمد نگر میں مولانا آزاد کے سامنے سوال یہ رہا ہوگا کہ وہ قید خانے میں اپنا وقت کیسے گزاریں، ترجمان القرآن کی تکمیل کا کام وہاں ہو نہیں سکتا تھا، اسی طرح بیشتر ان ہی اسباب کی بنا پر ان کے لیے کوئی تحقیقی اور علمی تصنیف ممکن نہیں تھی، ہاں وہ اپنے حافظہ کی مدد سے ایک حد تک اپنے سوانح حیات یا اپنے میموائرس قلم بند کر سکتے تھے۔ وہ یہ کام کر جاتے تو بڑا کام ہو جاتا، آزاد کی کہانی خود انہیں کے قلم سے، لیکن انھوں نے یہ نہیں کیا، البتہ قید خانے کی تنہائی میں اپنی افتادِ طبع کے تقاضے سے ہم آہنگ ہو کر انھوں نے اپنی زندگی کے بیتے دنوں کی کچھ یادوں کو تازہ کیا اور ماضی کی کئی باتوں کو کئی خطوط میں، کہیں مربوط اور کہیں جستہ جستہ، ایک خاص ادبی اسلوب میں پیش کیا اور اسی کے ساتھ

بعض خطوط میں انھوں نے اہم موضوعات سے متعلق اپنا نتیجہ فکر اور اپنے تاثرات بیان کیے۔ ان میں ایک خاص موضوع خود زندگی ہے، بلکہ اس بات کو یوں کہنا شاید زیادہ صحیح ہو کہ غبار خاطر کے متفرق موضوعات کا اصل سر رشتہ زندگی ہی ہے اپنی پیچیدگیوں، نیرنگیوں اور رعنائیوں کے ساتھ۔

ہمارا خیال ہے کہ مولانا کو اس فیصلے میں دیر نہیں لگی ہوگی کہ زنداں کی (بقول مولانا) ان دراز نفسیوں کا مخاطب کون ہو۔ کاروان خیال کا پہلا خط (مورخہ ۴ ستمبر ۱۹۴۲ء) صاف بول رہا ہے کہ غبار خاطر کے خطوط کا مخاطب کون ہو سکتا تھا۔ اس کا ایک ٹکڑا دیکھیے۔

"اس وقت صبح کے ساڑھے چار بجے ہیں، چائے پی رہا ہوں اور یہ خط لکھ رہا ہوں ؎

گرچہ دوریم بیادِ تو قدح می نوشیم   بُعدِ منزل نہ بود در سفر روحانی

یہ ساری دراز نفسی اس لیے ہے کہ کسی ہم نفس سے باتیں کرنے کو جی چاہتا تھا، آپ یاد آگئے۔ ملاقات میسر نہیں ہے تو دل کی آرزو مندیوں کو صفحوں پر بکھیر رہا ہوں ؎

در ہیچ نسخہ معنیٔ لفظ امید نیست   فرہنگ نامہ ہائے تمنا نوشتہ ایم

اس وقت سوچ رہا تھا آپ سے آخری ملاقات کب ہوئی تھی؟ غالباً ۱۹۲۰ء میں۔ حکیم صاحب مرحوم کے یہاں دہلی میں۔ میں نظر بندی سے چھوٹا تھا، آپ حیدر آباد سے آئے تھے، دونوں جہتوں میں بُعد المشرقین تھا، مگر طبیعت کی ہم ذوقی ایک صحبت میں جمع کر دیتی تھی ؎

بیا کہ رونق ایں کارخانہ کم نہ شود   زِ زہدِ ہمچو توئی یا بہ فسقِ ہمچو منی"

انسان پر، خصوصاً ایک حساس انسان پر مختلف کیفیتیں طاری ہوتی رہتی ہیں، آرٹسٹ بھی حساس انسانوں ہی کی ایک نوع ہے۔ مولانا آزاد کی شعر و ادب کی فطری

فنکارانہ صلاحیت کا یہ کمال تھا کہ وہ اپنی گہری شخصیت کو اپنے ہر احساس و جذبے، ہر موڑ، ہر کیفیت کے سچے اظہار و بیان میں ایک حسن تناسب کے ساتھ پوری کی پوری سمو دیتے تھے، آپ ان کے علم و ذوق کے تنوعات کو سامنے رکھیے پھر انکے طرز بیان پر نظر رکھیے، آپ دیکھیں گے کہ ان کے اسلوب بیان اور موضوع و مضامین میں کامل ہم آہنگی ہے ضروری نہیں کہ صحافت نگاری، دینی و علمی مباحث اور ادب و انشا کے میدانوں میں مولانا کی نگارشات سے اقتباس پیش کیے جائیں۔ اہل علم اس سے واقف ہیں۔

غبار خاطر کے خطوں میں مولانا آزاد نے کچھ سنجیدہ فلسفیانہ سوال اٹھائے ہیں، زندگی کیا ہے؟ زندگی کا مقصد کیا ہے؟ انسان کے وجود اور انسانی زندگی میں مذہب کا کیا مقام و مرتبہ ہے؟ ان خطوں کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ عام انسانی فہم و عقل سے ماورا ایک بلند تر مقام سے ان کا فکر اور ان کی آگہی آشنا ہے اور یہ آگہی ہمیں بھی اس مقام سے باخبر ہونے کے روحانی تجربے میں شریک ہونے کی دعوت دے رہی ہے، ایسے خطوں میں مولانا کا ذہنی کرب جو ایک حساس عالم و مفکر، بڑے ادیب اور عظیم فنکار کا مقدر ہوتا ہے، ذاتی نہیں رہ جاتا، آفاقی بن جاتا ہے اور اپنے احساسات و تصورات کی دنیا میں، ہم پر بھی رنج و الم کے کیف، تنہائی کے حسن اور انسانی زندگی کی اہمیت کے معنی کچھ کچھ کھلنے لگتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"اس طلسم ہستی کے معمے پر غور کیجیے جو خود ہمارے اندر اور ہمارے چاروں طرف پھیلا ہوا ہے، انسان نے جب سے ہوش و آگہی کی آنکھیں کھولی ہیں، اس معمے کا حل ڈھونڈھ رہا ہے۔ لیکن اس پرانی کتاب کا پہلا اور آخری ورق اس طرح کھو گیا ہے کہ نہ تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ شروع کیسے ہوئی تھی نہ اسی کا سراغ ملتا ہے کہ ختم

کہاں جا کر ہوگی اور کیونکر ہوگی ؟

اول و آخر ایں کہنہ کتاب افتادست"

مولانا فلسفے اور سائنس کی بعض ممتاز شخصیتوں اور ان کے نظریوں کا ذکر کرتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ عقل اور علم کے سہارے ہم نے فکر و نظر کی راہوں میں بڑی مسافتیں طے کی ہیں، لیکن طلسم ہستی کا معمہ جوں کا توں باقی ہے اور ہمیں اس کا کوئی حل نہیں ملتا۔ "روشنی گم ہو جاتی ہے، آنکھیں پتھرا جاتی ہیں اور عقل و ادراک کے سارے سہارے جواب دے دیتے ہیں۔" لیکن جیسے ہی ہم یہ کہہ اٹھتے ہیں کہ کائنات کے پس پردہ ایک صاحب ادراک و ارادہ قوت موجود ہے، تو تاریکی چھٹ جاتی ہے اور چاروں طرف روشنی پھیل جاتی ہے۔

اس کے بعد مولانا ایک جرمن فلسفی ریحل (Riehl)[۱] کے حوالے سے اپنی اس بات کا اثبات کرتے ہیں کہ :

"انسان کے حیوانی وجود نے مرتبۂ انسانیت میں پہونچ کر نشو و ارتقا کی تمام پچھلی منزلیں بہت پیچھے چھوڑ دی ہیں اور بلندی کے ایک ایسے ارفع مقام پر پہونچ گیا ہے جو اسے کرۂ ارضی کی تمام مخلوق سے الگ اور ممتاز کر دیتا ہے۔ اب اسے اپنی لامحدود ترقیوں کے لیے ایک لامحدود بلندی کا نصب العین چاہیے، جو اسے برابر اوپر ہی کی طرف کھینچتا رہے۔۔۔ سوال یہ ہے کہ یہ لامحدود بلندیوں کا نصب العین کیا ہو سکتا ہے ؟ ہمیں بلا تامل تسلیم کر لینا پڑے گا کہ خدا کی ہستی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ ہستی اس کے سامنے سے ہٹ جائے تو پھر اس کے لیے اوپر کی طرف دیکھنے کیلئے

۱۔ انسان ترقی کر کے سیدھا کھڑا نہیں رہ سکتا جب تک کوئی ایسی چیز اسکے سامنے موجود نہ ہو، جو خود اس سے بلند تر ہے، وہ کسی بلند چیز کے دیکھنے ہی کے لیے سر اوپر کر سکتا ہے۔" (ریحل)

کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔"[۱]

پھر مکتوب نمبر ۱۳ مورخہ ۱۸ اکتوبر ۱۹۴۳ء میں مولانا نے اس مسئلہ کو ایک دوسرے زاویۂ نگاہ سے دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کی ہے۔ وہ خدا کے صفاتی اور غیر صفاتی تصور سے متعلق کچھ باتیں کی ہیں جو مسئلہ کا ایک اذعانی و اعتقادی حل ہے۔ اس موقع پر انھوں نے ترجمان القرآن جلد اول میں تفسیر سورہ فاتحہ کے بعض مباحث کی طرف توجہ دلائی ہے یہیں یہ بات بھی کہہ دی جائے تو مناسب ہے کہ ترجمان القرآن کی بعض عبارت اور اسلوب کے نقوش غبار خاطر کے بعض مقامات پر صاف نظر آتے ہیں۔

محض استدلالی ذریعۂ علم سے وہ بلند مقام نظر جو مناسب کو اپنی جارحیت کے علم و انضباط سے حاصل نہ ہو سکا، کشف و مشاہدہ کی داخلیت سے اس کا ادراک کیا جا سکتا ہے،

"لیکن اگر ہم کشف و مشاہدہ کے عالم کی خبر نہیں رکھنا چاہتے، جب بھی حقیقت کی نشانیاں اپنے چاروں طرف دیکھ سکتے ہیں۔" (غبار خاطر، مکتوب نمبر ۱۲)

مولانا آزاد کو ہمیشہ یہ احساس رہا کہ وہ بے موسم کا پھل ہیں، انکے خیال میں انکی منفرد طبیعت ناوقت کی طبیعت تھی جسکی وجہ سے زندگی میں انہیں ایسے حالات کا سامنا کرنا پڑا جس نوع کی شخصیتوں کا مقدر ہوا کرتی ہیں

۱۔ غبار خاطر، ساہتیہ اکادمی ایڈیشن ۱۹۸۳ء، مکتوب نمبر ۱۲۔ اس مکتوب کے شروع میں مولانا نے صدیقِ مکرم کو لکھتے ہیں: "آج بھی جام وہی ہے جو روز گردش میں آتا ہے لیکن جام میں جو کچھ انڈیل رہا ہوں اسکی کیفیتیں کچھ بدلی ہوئی پایئے گا، ع از مئے دوشین قدرے تند تر۔ بارہا مجھے خیال ہوا کہ ہم خدا کی ہستی کا اقرار کرنے پر اس لیے بھی مجبور ہیں کہ اگر نہ کریں تو کارخانۂ ہستی کے معمے کا کوئی حل باقی نہیں رہتا اور ہمارے اندر ایک حل کی طلب ہے جو ہمیں مضطرب رکھتی ہے۔

زمانے کی عام طبیعتوں سے میل نہیں کھاتیں۔ اس لیے اگرچہ زمانے کے لیے وہ اجنبی رہتی ہیں۔ پھر بھی ان کی قدر و قیمت ہمیشہ بلند اور گراں رہتی ہے۔ حکیم صدرائے شیرازی کا یہ شعر وہ اکثر پڑھا کرتے تھے:

کم لذتم و قیمتم افزوں ز شمار ست　　　گوئی ثمر بیشتر از باغِ وجودم

لکھتے ہیں:

"لوگ بازار میں دکان لگاتے ہیں تو ایسی جگہ ڈھونڈ کر لگاتے ہیں جہاں خریداروں کی بھیڑ لگتی ہو۔ میں نے جس دن اپنی دکان لگائی تو ایسی جگہ ڈھونڈ کر لگائی جہاں کم سے کم گاہکوں کا گذر ہو سکے ..... مذہب میں، ادب میں، سیاست میں، فکر و نظر کی عام راہوں میں جس طرف بھی نکلنا پڑا اکیلا ہی نکلنا پڑا۔ کسی راہ میں بھی وقت کے قافلوں کا ساتھ نہ دے سکا ..... جس راہ میں بھی قدم اٹھایا وقت کی منزلوں سے اتنا دور ہوتا گیا کہ جب مڑ کے دیکھا تو گرد راہ کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ اور یہ گرد بھی اپنی ہی تیز رفتاری کی اڑائی ہوئی تھی:

آں نیست کہ من ہمنفساں را بگزارم　　　با آبلہ پایاں چہ کنم قافلہ تیز ست"[1]

جس مکتوب کا یہ اقتباس ہے اس کی سوانحی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اس میں مولانا نے اپنے بچپن کے حالات، اپنی تعلیم و تربیت کے مختلف مرحلوں، درس نظامی کی خوبیوں اور کمزوریوں اور اپنے موروثی عقائد و رسوم کی تقلید کے خلاف اپنے دل کی چبھن کا ذکر بڑے شگفتہ انداز میں کیا ہے۔ یہ مکتوب اچھی نثر بلکہ اچھی علمی و ادبی نثر کا ایک خوبصورت نمونہ ہے۔

ایک اور خط میں مولانا لکھتے ہیں کہ طالب علمی ہی کے زمانے سے فلسفہ سے انھیں دلچسپی تھی۔ عمر کے ساتھ یہ دلچسپی بڑھتی گئی۔ لیکن آخر میں وہ اس نتیجے پر پہونچے کہ زندگی کے علمی تجربوں میں یہ ہمارا ساتھ نہیں دے سکتا: اسی طرح سائنس مادی زندگی کے اصولوں اور فارمولوں سے ہمیں باخبر بناتا ہے

[1] غبارِ خاطر؛ ساہتیہ اکادمی اڈیشن مکتوب نمبر ۱۱۔

لیکن روحانیات و اخلاقیات کی دنیا سے اسے کوئی سروکار نہیں۔ پھر وہ سوال کرتے ہیں کہ آخر ہم زندگی کی تلخیوں میں ایجابی تسکین اور سہارے کے لیے کدھر دیکھیں؟:

"ہمیں مذہب کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔ یہی دیوار ہے جس سے ایک دکھتی ہوئی پیٹھ ٹیک لگا سکتی ہے ..... بلاشبہہ مذہب کی وہ پرانی دنیا جس کی ما فوق الفطرت کارفرمائیوں کا یقین ہمارے دل و دماغ پر چھایا رہتا تھا، اب ہمارے لیے باقی نہیں رہی۔ اب مذہب بھی ہمارے سامنے آتا ہے تو عقلیت اور منطق کی ایک سادہ اور بے رنگ چادر اوڑھ کر آتا ہے اور ہمارے دلوں سے زیادہ ہمارے دماغوں کو مخاطب کرنا چاہتا ہے۔ تاہم اب بھی تسکین اور یقین کا سہارا مل سکتا ہے تو اسی سے مل سکتا ہے ..... فلسفہ شک کا دروازہ کھول دے گا اور پھر اسے بند نہیں کر سکے گا۔ سائنس ثبوت دے دے گا، مگر عقیدہ نہیں دے سکے گا۔ مگر مذہب ہمیں عقیدہ دیتا ہے اگرچہ ثبوت نہیں دیتا۔ اور یہاں زندگی بسر کرنے کے لیے صرف ثابت شدہ حقیقتوں ہی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ عقیدہ کی بھی ضرورت ہے۔ ہم صرف ان ہی باتوں پر قناعت نہیں کر لے سکتے جنھیں ثابت کر سکتے ہیں اور اس لیے مان لیتے ہیں۔ ہمیں کچھ باتیں ایسی بھی چاہئیں جنھیں ثابت نہیں کر سکتے، لیکن ماننا پڑتا ہے۔"[1]

حکایت بادہ و تریاک ہو یا حکایت زاغ و بلبل، چائے نوشی کا کیف اور چائے کی کیف آور تاریخ و تذکرہ ہو یا پھولوں کی مختلف قسموں کا ذکر اور ان کے کھلنے اور مرجھانے کا بیان مولانا کا علم، مشاہدہ اور اسلوب نگارش دامن فکر و دانش کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔

حکایت زاغ و بلبل کے وہ مقامات جہاں بعض طائران خوش نوا و بدنما کا ذکر ہے مولانا کے

[1] غبارِ خاطر؛ ساہتیہ اکادمی اڈیشن مکتوب نمبر ۶۔

لطیف ذوقِ نغمہ کے ترجمان اور خوبصورت انشا پردازی کے اچھے نمونے ہیں۔ خاص طور پر وہ مقام جہاں طوطا، مینا، کوئل، ہندوستان کی پہاڑی بلبل اور ایران کی بلبل ہزار داستان کا ذکر ہے یہاں انھوں نے حافظ شیرازی کے اشعار سے موسم بہار کی آتش ریزی اور مرغان باغ کی قافیہ سنجی کے بیان کو کچھ اس طرح سے سنوارا ہے کہ یہ بیان خود ایک بہاریہ غزل بن گئی ہے۔ طوالت کے ڈر سے صرف ایک اقتباس پر اکتفا کی جاتی ہے۔ لکھتے ہیں :

"حقیقت یہ ہے کہ نوائے بلبل بہشتِ بہار کا ملکوتی ترانہ ہے، جو ملک اس بہشت سے محروم ہے، وہ اس ترانے کے ذوق سے بھی محروم ہے۔ گرم ملکوں کو اس عالم کی کیا خبر! پت جھڑ اور زمستان کی برفباری کے بعد جب موسم کا رخ پلٹنے لگتا ہے اور بہار اپنی ساری رعنائیوں اور جلوہ فروشیوں کے ساتھ باغ و صحرا پر چھا جاتی ہے تو اس وقت برف کی بے رحمیوں سے ٹھٹھری ہوئی دنیا یکایک محسوس کرنے لگتی ہے کہ اب موت کی افسردگیوں کی جگہ زندگی کی سرگرمیوں کی ایک نئی دنیا نمودار ہوگئی ۔ ۔ ۔ ۔ آسمان و زمین کی ہر چیز جو کل تک محرومیوں کی سوگواری اور افسردگیوں کی جانکاہی تھی آج آنکھیں کھولیے تو حسن کی عشوہ طرازی ہے، کان لگائیے تو نغمے کی جاں نوازی ہے، سونگھیے تو سر تا سر بو کی عطر بیزی ہے ؎

صبا بہ تہنیت پیرِ مے فروش آمد | کہ موسم طرب و عیش و نائے و نوش آمد
ہوا مسیح نفس گشت و باد نافہ کشا | درخت سبز شد و مرغ در خروش آمد
تنور لالہ چناں بر فروخت بادِ بہار | کہ غنچہ غرق عرق گشت و گل بجوش آمد

عین جوش و سرمستی کی ان عالمگیریوں میں بلبل کے مستانہ ترانوں کی گت شروع ہو جاتی ہے اور یہ نغمہ سرائے بہشتی اس محویت اور خود رفتگی کے ساتھ گانے لگتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے خود سازِ فطرت کے تاروں سے نغمے نکلنے لگے۔ اس وقت انسانی احساسات میں جو

تہلکہ مچنے لگتا ہے، ممکن نہیں کہ حرف و صوت سے اس کی تعبیر آشنا ہو سکے۔ شاعر پہلے مضطرب ہوگا کہ اس عالم کی تصویر کھینچ دے۔ جب نہیں کھینچ سکے گا تو پھر خود اس کی تصویر بن جائے گا۔ وہ رنگ و بو اور نغمے کے اس سمندر کو پہلے کنارہ پر کھڑے ہو کر دیکھے گا پھر کود پڑے گا اور خود اپنی ہستی کو بھی اسی کی ایک موج بنا دے گا ؎

بیا تا گل برافشانیم و مے در ساغر اندازیم | فلک را سقف بشگافیم و طرح نو دراندازیم
چو در دست است رودے خوش بزن مطرب سرودے خوش | کہ دست افشاں غزل خوانیم و پاکوباں سر اندازیم"

چڑیا چڑے کی کہانی (۱۷ر اور ۱۸ر مارچ ۱۹۴۳ء) کے خطوط میں ایک نقاد کو مولانا آزاد ایک فرار کی ذہنیت رکھنے والے سیاست داں نظر آئے تھے۔ یا ایک ایسی شخصیت جو اپنی شکست کی آواز بن کر رہ گئی تھی۔ اور اس کہانی کو انھوں نے حیات کے ضعف اور ولولہ ہائے زندگی کی غنودگی کی ترجمانی تصور کیا تھا، کیسی ستم ظریفی ہے یہ! مولانا آزاد اور فرار ؟ مولانا آزاد اور ضعف حیات ؟۔ حقیقت یہ ہے کہ چڑیا چڑے کی کہانی جہاں ایک طرف زبان و بیان پر اس کے مصنف کی بے مثال قدرت کا اظہار ہے۔ وہیں مجاز کا وہ پردہ بھی ہے جس کے پیچھے ایک بڑی حقیقت جلوہ گر ہے۔ قلعۂ احمد نگر کی چڑیوں کی اس بستی میں ماحولیاتی مناسبت اور ظاہری حسن و صورت کے پیش نظر مولانا نے ایک کا نام قلندر اور ایک دوسرے کا موتی رکھا۔ ایک اور کا نام مُلّا رکھا اور ایک کا صوفی۔ یہ چڑیا اور چڑے خوبصورت تمثیل ہیں انسانوں کی بستی کے ان ناموں سے وابستہ کرداروں کی۔ مولانا نے اپنے زورِ بیان سے اپنے مشاہدے اور تجربے کی کیسی سچی تصویر پیش کی ہے اس کہانی میں یہ چڑیا کا بچہ جو ابھی ابھی گھونسلے سے نکلا ہے کیسا بے بس ہے۔ ابھی اڑنا نہیں جانتا، ڈرتا ہے۔ ماں اسے اکساتی رہی لیکن وہ زمین سے بالشت بھر بھی اونچا نہ جا سکا۔ لیکن ایک دن یکایک وہ اڑتا ہے اور فضائے بسیط میں دور بہت دور بلندیوں پر جا کر نظروں سے غائب ہو جاتا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں :

"کیا کہوں، اس منظر نے کیسی خود رفتگی کی حالت طاری کر دی۔ بے اختیار یہ شعر زبان پر آگیا ؎

نیروئے عشق بیں کہ دریں دشت بیکراں ✣ گامے نہ رفتہ ایم و بپایاں رسیدہ ایم

دراصل یہ کچھ نہ تھا، زندگی کی کرشمہ سازیوں کا ایک معمولی سا تماشا تھا۔۔۔۔ جوں ہی (چڑیا کے اس بچے کی) "خود شناسی" جاگ اٹھی اور اسے اس حقیقت کا عرفان حاصل ہوگیا کہ "میں اڑنے والا پرندہ ہوں"۔ اچانک قالبِ بے جان کی ہر چیز از سرِ نو جاندار بن گئی"۔

اور پھر مولانا نے یہ حکیمانہ نکتہ بیان کیا کہ "بے طاقتی سے توانائی، غفلت سے بیداری، بے پروبالی سے بلند پروازی اور موت سے زندگی کا پورا انقلاب چشم زدن میں ہوگیا۔ غور کیجئے تو یہی ایک چشم زدن کا وقفہ زندگی کے پورے افسانہ کا خلاصہ ہے۔" انسان کا بھی یہی حال ہے۔ وہ ایک لمحہ جب اس کی خود شناسی بیدار ہوتی۔ اور اس کے اندر کا عرفان جاگ اٹھتا ہے اس کے لیے فیصلہ کن ثابت ہوتا ہے اور وہ ایک ہی جست میں افلاک کی رفعتوں کو چھوٗ لیتا ہے ؎

عشق کی ایک جست نے طے کر دیا قصہ تمام ✣ اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

مولانا آزاد کی منفرد شخصیت کا عکس ہم غالب کے اس شعر میں دیکھ سکتے ہیں ؎

در عشق غنچہ ایم کہ لرزد ز بادِ صبح ✣ در کارِ زندگی صفت سنگِ خارہ ایم

اور ان کی یہ شخصیت جلال و جمال دونوں کے ایک حسین اور خوشگوار امتزاج کی صورت میں غبارِ خاطر میں نمایاں ہے۔ جہاں اس کی تب و تاب سے ان کی تحریر کا ہر فقرہ روشن ہے۔ اور ان کے اسلوب کی شعری لطافت ایک موجِ زریں کی طرح ہر سطر میں رقص کناں ہے۔ اور شاید اسی لیے غبارِ خاطر کے خطوط بعض لوگوں کے نزدیک مکتوب نگاری سے زیادہ انشائیہ نگاری کی روایت کی خوش آیند توسیع ہے۔

غبارِ خاطر کے بعض خطوط میں ہمیں منظر نگاری کی بہت اچھی مثالیں ملتی ہیں۔ ایک چیز ہوتی ہے داخلی منظر نگاری یعنی خیال منظر نگار ادیب کی داخلی دنیا میں پہلے الفاظ کی معنویت کے ساتھ مل کر ایک سماں پیدا کرتا ہے۔ پھر خود الفاظ اس سماں کو تجسیم کے عمل سے خارجی دنیا میں لے آتے ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولانا کو اس طرح کی منظر نگاری پر قدرت حاصل تھی۔ صرف ایک اقتباس مگر قدرے طویل:

"رات کا سناٹا، ستاروں کی چھاؤں، ڈھلتی ہوئی چاندنی اور اپریل کی بھیگی ہوئی رات، چاروں طرف تاج کے منارے سر اٹھائے کھڑے تھے۔ برجیاں دم بخود بیٹھی تھیں۔ بیچ میں چاندنی سے دھلا ہوا مرمریں گنبد اپنی کرسی پر بے حس و حرکت متمکن تھا۔ نیچے جمنا کی روپہلی جدولیں بل کھا کھا کر دوڑ رہی تھیں اور اوپر ستاروں کی ان گنت نگاہیں حیرت کے عالم میں تک رہی تھیں۔ نور و ظلمت کی اس ملی جلی فضا میں اچانک پردہ ہائے ستار سے نالہ ہائے بے حرف اٹھتے اور ہوا کی لہروں پر بے روک تیرنے لگتے۔ آسمان سے تارے جھڑ رہے تھے اور میری انگلی کے زخموں سے نغمے ؎

زخمہ بر تارِ رگِ جاں می زنم ✣ کس چہ داند تا چہ دستاں می زنم

کچھ دیر تک فضا تھمی رہتی۔ گویا کان لگا کر خاموشی سے سن رہی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ ہر تماشائی حرکت میں آنے لگتا، چاند بڑھنے لگتا یہاں تک کہ سر پر آکھڑا ہوتا۔ تارے دیدے پھاڑ پھاڑ کر تکنے لگتے، درختوں کی ٹہنیاں کیفیت میں آآکر جھومنے لگتیں، رات کے سیاہ پردوں کے اندر سے عناصر کی سرگوشیاں صاف صاف سنائی دیتیں۔ بارہا تاج کی برجیاں اپنی جگہ سے ہل گئیں اور کتنے ہی مرتبہ ایسا ہوا کہ منارے اپنے کاندھوں کو جنبش سے نہ روک سکے۔ آپ باور کریں یا نہ کریں مگر یہ واقعہ ہے کہ اس عالم میں بارہا میں نے برجیوں سے باتیں کی ہیں اور جب

کبھی تاج کے گنبدِ خاموش کی طرف نظر اٹھائی ہے تو اس کے لبوں کو ہلتا ہوا پایا ہے ؎

تو مپندار کہ ایں قصہ ز خود می گویم ✿ گوش نزدیک لبم آر کہ آوازے ہست

مولانا کا یہ مکتوب سب سے زیادہ طویل ہے۔ اس کا خاص موضوع موسیقی اور خود ان کا ذوقِ موسیقی ہے۔ پورا مکتوب ادبی انشاپردازی اور تاریخ نویسی کے دلکش اسلوب کا خوبصورت نمونہ اور اردو میں جدید نثر نگاری کی اچھی مثال ہے۔ اس سے فنِ موسیقی سے متعلق مولانا کے گہرے مطالعے کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور اس بات کا علم بھی کہ موسیقی کے فنونِ لطیف کی ترقی میں ہندوستانی مسلمانوں کا کیا حصہ ہے۔ آخر میں مولانا لکھتے ہیں :

" اس بات کی عام شہرت ہوگئی ہے کہ اسلام کا دینی مزاج فنونِ لطیفہ کے خلاف ہے اور موسیقی محرماتِ شرعیہ میں داخل ہے۔ حالانکہ اس کی اصلیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ فقہاء نے سدِ وسائل کے خیال سے اس بارے میں تشدد کیا۔ اور یہ تشدد بھی باب قضاء سے تھا نہ کہ باب تشریع سے ..... لیکن یہ بحث میں یہاں نہیں چھیڑنا چاہتا۔ یہاں جس زاویۂ نگاہ سے معاملہ پر نظر ڈالی جارہی ہے وہ دوسرا ہے۔"

کیا اچھا ہوتا کہ مولانا نے کوئی رسالہ یا مقالہ اس موضوع پر لکھا ہوتا۔

غالب کے بارے میں کہا جاتا ہے اور صحیح ہی کہا جاتا ہے کہ اس کے اشعار کے حسن اور اس کے تخیل کی بلندی میں دوسرے رنگوں کے ساتھ صنعتِ تضاد کی خوش رنگی بھی شامل ہے۔ جس طرح 'اشیا' اپنے اضداد سے جانی اور پہچانی جاتی ہیں۔ اسی طرح شاعری، مصوری اور موسیقی کے شاہکاروں میں بھی تضاد سے ایک حسن اور ایک آہنگِ خوش پیدا ہوتا ہے۔ آپ ذرا اپنے حافظہ پر زور دیجیے آپ کو غالب کے ایسے دسیوں اشعار یاد آجائیں گے۔ غبارِ خاطر میں مولانا آزاد نے

[1] غبارِ خاطر، ساہتیہ اکادمی ایڈیشن مکتوب نمبر ۲۴۔

غالباً سبھی خطوط کے مختلف پیراگرافوں میں صنعتِ تضاد سے کام لے کر اپنی ادبی نثر کو ایسے مقامِ بلند تک پہونچا دیا ہے کہ مولانا کی یہ تصنیف اردو ادب میں ایک امتیازی شان کی حامل بن گئی ہے۔

مولانا آزاد نے غالب کا بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے غالب کی شخصیت کے ایک خاص پہلو سے متعلق غالب سے اپنی مماثلت بھی تلاش کر لی تھی۔ ۲۹ ر اگست ۱۹۴۲ء کے خط میں لکھتے ہیں :

" میں نے سیاسی زندگی کے ہنگاموں کو نہیں ڈھونڈھا تھا، سیاسی زندگی کے ہنگاموں نے مجھے ڈھونڈھ نکالا۔ میرا معاملہ سیاسی زندگی کے ساتھ وہ ہوا جو غالب کا شاعری کے ساتھ ہوا تھا ؎

ما نبودیم بدیں مرتبہ راضی غالب ✿ شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فنِ ما"

اپنی دوسری تحریروں کی طرح غبارِ خاطر میں مولانا آزاد نے غالب کے اشعار اور مصرعے خاصی تعداد میں استعمال کیے ہیں۔ اور انھوں نے غالب سے ترکیبیں بھی مستعار لی ہیں۔ بلکہ بعض مقامات ایسے ہیں جہاں دونوں شخصیتوں کے ادبی شعور میں ہم آہنگی کا احساس ہوتا ہے۔ صنعتِ تضاد سے کام لینے کی ایک مثال :

" رات ایک ایسی حالت میں کٹی جسے نہ تو اضطراب سے تعبیر کر سکتا ہوں، نہ سکون سے۔ آنکھ لگ جاتی تھی تو سکون تھا، کھل جاتی تھی تو اضطراب تھا۔ گویا ساری رات دو متضاد خوابوں کے دیکھنے میں بسر ہوگئی۔ ایک تعمیر کی نقش آرائی کرتا تھا تو دوسرا تخریب کی برہم زنی ؎

بیداریِ میانِ دو خواب است زندگی ✿ گردِ تخیل دو سراب است زندگی

از لطمۂ دو موج حبابے دمیدہ است ✿ یعنی طلسمِ نقش بر آب است زندگی

غالب کے تعلق سے ایک اور مثال:

"مرزا غالب نے رنجِ گراں نشین کی حکایتیں لکھی تھیں۔ صبر گریز پا کی شکایتیں کی تھیں ؎

کبھی حکایتِ رنجِ گراں نشیں لکھیے ٭ کبھی شکایتِ صبرِ گریز پا کہیے

لیکن یہاں نہ رنج کی گراں نشینیاں ہیں کہ لکھوں، نہ صبر کی گریز پائیاں ہیں کہ سناؤں۔ رنج کی جگہ صبر کی گراں نشینیوں کا خوگر ہو چکا ہوں۔ صبر کی جگہ رنج کی گریز پائیوں کا تماشائی رہتا ہوں۔ عرفی کا وہ شعر کیا خوب ہے، جو ناصر علی نے اس کے تمام کلام میں سے چنا تھا ؎

من ازیں رنجِ گراں بار چہ لذت یابم ٭ کہ باندازۂ آں صبر و ثباتم دادند"

غبارِ خاطر کو پڑھ کر بعض لوگوں کا خیال اس طرف جاتا ہے کہ ان خطوط میں مولانا آزاد نے صنعت گری، تصنع، خود نمائی اور اپنے ایگو کا بے پناہ اظہار کیا ہے۔ بعض یہ کہتے ہیں کہ یہ خطوط خود کلامی کا اچھا نمونہ ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ یہ محسوس ہوتا ہے کہ خود کلامی کے دوران لکھنے والے کو یہ خواہش بھی ہے کہ کوئی اور بھی اس کی باتیں سنے[2]۔ جہاں تک 'ایگو' کے اظہار اور اس خواہش کا تعلق ہے کہ خود کلامی کی آواز دوسروں تک پہونچے، یہ تو بقول مولانا "انانیتی ادبیات" کی خصوصیت ہے۔ اور بقول مولانا:

"انانیتی ادبیات سے مقصود اس طرح کی تمام خامہ فرسائیاں ہیں جن میں ایک مصنف کا انجو (Ego) یعنی "میں" نمایاں طور پر سر اٹھاتا ہے۔ مثلاً خود نوشت سوانح عمریاں، ذاتی واردات و تاثرات، مشاہدات و تجارب، شخصی اسلوبِ نظر و فکر۔ میں نے نمایاں طور کی قید اس لیے لگائی کہ اگر نہ لگائی جائے تو دائرہ بہت زیادہ وسیع ہو جائے گا،

---

[1] غبارِ خاطر خط نمبر (۸) ۱۹ر اگست ۱۹۴۲ء۔ [2] کسی کا قول ہے کہ تنہائی اچھی چیز ہے لیکن کوئی ایک ایسا تو ضرور ہونا چاہیے جس سے کہہ سکیں کہ تنہائی اچھی چیز ہے۔

کیونکہ غیر نمایاں طور پر تو ہر طرح کی مصنّفات میں مصنف کی انانیت ابھر سکتی ہے۔ اور ابھرتی رہتی ہے۔ اگر اس اعتبار سے صورتِ حال پر نظر ڈالیے تو ہماری درماندگیوں کا کچھ عجیب حال ہے۔ ہم اپنے ذہنی آثار کو ہر چیز سے بچا لے جا سکتے ہیں مگر خود اپنے آپ سے بچا نہیں سکتے۔ ہم کتنا ہی ضمیر غائب اور ضمیر مخاطب کے پردوں میں چھپ کر چلیں لیکن ضمیر متکلم کی پرچھائیں پڑتی ہی رہے گی۔ ہم جہاں جاتے ہیں ہمارا سایہ ساتھ جاتا ہے۔ ہماری کتنی ہی خود فراموشیاں ہیں جو در اصل ہماری خود پرستیوں سے ہی پیدا ہوتی ہیں!"

۹ر جنوری ۴۳ء کے خط میں مولانا نے انانیتی شعور کا بڑا اچھا تجزیہ کیا ہے اور ان کے نزدیک اس کی اعلیٰ و ارفع صورت وہ ہے جہاں بوجھل صنعت گرانہ وضعیت کے بجائے بے تکلفانہ واقعیت ہو۔ اس سلسلے میں انھوں نے مغرب و مشرق کے ادبیات سے کئی ادیبوں اور مصنفوں کے کام اور تصنیفی نام کو بطور مثال پیش کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ مستثنیات ہیں اور ایسی شخصیتیں ہیں جو کبھی کبھی دنیا کے مَسرح (اسٹیج) پر نمودار ہو جاتی ہیں۔ "ان کی انانیت کی مقدار اضافی نہیں ہوتی بلکہ مطلق نوعیت رکھتی ہے۔ یعنی خود انھیں ان کی انانیت جتنی بڑی دکھائی دیتی ہے اتنی ہی بڑی دوسرے بھی دیکھنے لگتے ہیں!" یہ عبارت لکھتے وقت یقیناً مولانا کی اپنی شخصیت بھی ان کے سامنے ہوگی کیونکہ اس کے بعد انھوں نے جن سطروں کو قلمبند کیا ہے ان کی گونج ان کے بعض دوسرے نثر پاروں میں بھی ہمیں سنائی دیتی ہے۔ لکھتے ہیں:

"ایسے اخص الخواص افراد کو عام معیارِ نظر سے الگ رکھنا پڑے گا۔ ایسے لوگ فکر و نظر کے عام ترازوؤں میں نہیں تولے جا سکتے۔ ادب و تصنیف کے عام قوانین انھیں اپنے کلیوں سے نہیں پکڑ سکتے۔ زمانے کو ان کا یہ حق تسلیم کر لینا پڑتا ہے کہ وہ جتنی مرتبہ بھی چاہیں "میں" بولتے رہیں۔ ان کی ہر "میں" ان کی ہر 'وہ' اور 'تم' سے کہیں زیادہ دلپذیر ہوتی ہے"

اب اس کے بعد یہ بات کہ غبار خاطر کے بعض خطوط میں صنعت گری اور خود نمائی کے آثار ملتے ہیں تو ہمارا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ اور جن لوگوں کو ایسا محسوس ہوتا ہے ان کی آنکھیں شاید ان کے اپنے عہد میں اس ایک شخص کے نوع بہ نوع کمالات کی تابانیوں سے خیرہ ہوجاتی ہیں جس کا نام ابوالکلام آزاد تھا۔ غبار خاطر کے خطوط زندگی کی جس منزل میں لکھے گئے، اس وقت وہ اتنے بڑے اور مشہور ہوچکے تھے کہ شہرت اور عظمت انھیں خود تلاش کر رہی تھی۔ اب کسی صناعی اور خود نمائی کی ضرورت انھیں نہ تھی۔ علم و عمل اور فکر و نظر کی بلندیوں نے ان کی شخصیت کو اتنی حسین اور عظیم بنا دیا تھا کہ اسے تکلف و تصنع سے کسی بناؤ سنگار کی ضرورت نہ تھی۔

مولانا ابوالکلام آزاد جس عہد سے تعلق رکھتے تھے اس کے علمی و تعلیمی ماحول کی تشکیل میں درس نظامی کے لبرل عناصر کے ساتھ عہد جدید کے تعلیمی نصاب کی لبرل ازم کا بھی ایک خاص عنصر شامل تھا۔ اسی لیے اس عہد کے ادیبوں، مورخوں، مصنفوں اور شاعروں کے یہاں ہمیں دانشوری کی یک رخی نہیں بلکہ ایک ہمہ جہتی روایت ملتی ہے۔ ان کی دلچسپیوں کے دائرے وسیع تھے اور ان کا موضوع بیک وقت علم، ادب، مذہب اور سیاست غرض سب کچھ تھا۔ مولانا شبلیؒ اور مولانا آزادؒ علم و دانش اور تصنیف و تالیف کی اس ہمہ گیر روایت کے بہترین نمونے تھے۔ دونوں کے اسلوب میں ہمیں اردو ادب پر فارسی زبان و ادب کے گہرے اثر کا خوبصورت اظہار ملتا ہے۔

جس معاشرے میں شعر العجم جیسی کتاب لکھی اور پڑھی جائے اس میں ادبی نگارشات تغزل کے اثر سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکتیں۔ استعارے، تشبیہیں اور تلمیحیں ان نگارشات کو رعنائی فکر و اظہار بخشتی ہیں۔ اسی طرح اردو نثر میں اشعار کے استعمال کی بھی ایک روایت ہے۔ اور یہ ہمارا مزاج بن گئی ہے۔ ہم گفتگو بھی اشعار کے سہارے کے بغیر نہیں کر سکتے۔ غزل کے اشعار کی اشاریت اور علامتیت سے اپنی بات کو موثر اور موثر بنانے کا یہ رجحان اردو والوں کی

خصوصیت رہا ہے۔ مولانا آزاد نے اس عمل کو ایک فن بنا دیا۔ غبار خاطر اس کا بین ثبوت ہے اگرچہ کبھی کبھی اس سے عبارت کی روانی مجروح ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ عام طور پر اشعار مولانا کی نثر کا جزو لاینفک بن کر اس طرح معنی خیز بن جاتے ہیں جیسے کہ بقول صدیق الرحمٰن قدوائی " وہ مولانا کی نثر میں آنے سے پہلے خود اپنے معنی کی تلاش میں تھے..... ظاہر ہے کہ جس نثر میں منطق اور شعریت کی یہ سنگت ہو وہ اپنے پڑھنے والوں سے ادبی مذاق کی ایک اعلیٰ سطح کا تقاضا کرنے میں حق بجانب ہوگی۔"

مشہور نقاد خلیل الرحمٰن اعظمی کی یہ بات اہمیت رکھتی ہے کہ غبار خاطر "تصنیف" نہیں بلکہ ادبی "اختراع" ہے۔ غبار خاطر کا ابوالکلام واعظ اور خطیب نہیں ہے۔ یہاں ایک خاص رچاؤ سے اس کی شخصیت کا داعی اور اُپدیشک، فلسفی اور حامی مذہب، ادیب اور شاعر، مصور اور مغنی ایک اکائی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ غبار خاطر ایک ایسا پردہ ہے جس پر ابوالکلام کی روح پورے طور پر جلوہ گر ہوئی ہے۔ اس لیے اسے محض خطوں کا مجموعہ سمجھ کر پڑھنا بھی صحیح نہیں ہے..... جس طرح مکالمات افلاطون پڑھتے وقت ہم مکالمے کے وہ معنی نہیں لیتے جو ڈرامے میں لیتے ہیں۔ اسی طرح غبار خاطر میں ہم مکتوب نگاری کے عام اسلوب یا معیار کو نظر انداز کر دینے پر مجبور ہیں۔ یہاں ورائے شاعری چیزے دگر ہست والی بات ہے۔

افسوس کہ مولانا آزاد کی نثر بھی ان کے ساتھ ختم ہوگئی۔ کیونکہ ان کی نثر ان کی شخصیت تھی۔ اور یہ شخصیت جس سانچے میں ڈھلی تھی وہ سانچہ ہی ٹوٹ گیا ؎

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں۔

معارف کی ڈاک

شکاگو

۱۵ دسمبر ۱۹۹۲ء

(۱)

مکرم و محترم جناب اصلاحی صاحب! تحیۃ مسنونہ

گرامی نامہ ملا۔ بابری مسجد کا سانحہ بہر حال پیش آگیا۔ اس کی ذمہ داری اغیار سے زیادہ خود ہماری ہے۔ ہم نے حکومت، عدالت، ہندو لیڈروں کے مواعید پر بھروسہ کیا اپنی قوت عمل کا مظاہرہ نہ کیا، مسلمانوں کا جو خون مختلف شہروں میں بہہ رہا ہے وہ اجودھیا کی سرزمین پر اس وقت بہنا چاہیے تھا جبکہ فیض آباد کے مجسٹریٹ نے قانون کے سارے اقتضاآت کو فراموش کر کے مسجد ہندوؤں کے حوالہ کی اور اسی وقت سے مسجد مندر میں تبدیل ہوگئی اسی دن سے مسلمان بابری مسجد کا کیس ہار گئے۔ اب شور و ہنگامہ بے سود ہے ؎

فراق یار میں اب تو نصیر رویا کر　　گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر

آپ کے شذرات کا منتظر ہوں۔ امید کہ جناب مع متعلقین بخیریت ہوں گے۔

مخلص

سعید صدیقی

(۲)

اودئی کلاں۔ سوائی مادھوپور (راجستھان)

مکرم و محترم جناب مولانا اصلاحی صاحب! سلام و رحمت

نامۂ مکتوبہ مورخہ ۲۳ دسمبر ۹۲ء مجھے ۲۸ کو مل گیا تھا۔ ذرہ نوازی کے لیے نہایت شکر گذار ہوں۔ ۲۹ کو معارف بھی ملا۔ شذرات نے بے حد متاثر کیا۔ اس میں مسلمانوں کے لیے پیغام بھی ہے اور حالات سے عبرت بھی۔ سوئے حرم کی آخری قسط بھی بڑی موثر اور رواں دواں ہے۔ ص ۴۴۴ پر مولانا حالی کے مصرعہ کا نثر میں استعمال برمحل ہے۔ جس سے متاثر ہو کر بابری مسجد کی شہادت کا سال برآمد کیا ہے، چونکہ شاعری نہیں کرتا اس لیے اشعار تو مناسب نہیں تاہم قطعۂ تاریخی پیش خدمت ہے:۔

اے خاصۂ خاصان رسل وقت دعا ہے　　مسجد ہی رہی باقی نہ ملبہ ہی رہا ہے

افسردہ و مغموم تھا اس سانحے پہ جب　　ناگاہ مجھ سے آکے یہ ہاتف نے کہا ہے

آقا کو سنا سال یہ حالی کی زباں سے

"امت پہ تری آہ برا وقت پڑا ہے"

۴۴۱ + ۲ + ۴۱۰ + ۶ + ۲۰۳ + ۵۰۶ + ۲۰۳ + ۱۵ = ۱۹۹۱ = ۱۹۹۲ء

دیگر۔ اک ہادم مسجد نے نصیحت یہ سنائی　　یہ شیخ و برہمن بھی اس ملک میں بھائی

تب دل نے کہا اس سے ذرا یہ تو پوچھے　　"جابر یہ بتا شمع حرم کیوں ہے بجھائی"

۲۰۶ + ۱۵ + ۲۰۳ + ۴۱۰ + ۲۲۸ + ۸۶ + ۱۵ + ۱ = ۱۴۱۴ - ۱ = ۱۴۱۳ھ

اس میں تعمیہ یہ ہے کہ شمع یا اس کی لو جو بشکل الف ہوتی ہے اور جس کی عددی قدر ایک ہے، بجھ گئی تو ایک عدد از خود کم ہوگیا۔

فن تاریخ گوئی کی صنائع کا شمار نہیں، عجیب پیچیدہ فن ہے مگر نہایت دلچسپ۔

الحمد للہ یہاں ہر طرح خیریت ہے۔ جے پور وغیرہ میں بھی حالات نارمل ہوتے جا رہے ہیں تاہم دعاؤں کی سخت ضرورت ہے۔ امید ہے انشاء اللہ آپ مع اہل خانہ و رفقاء عافیت سے ہوں گے۔ بشرط سہولت سبھی حضرات کی خدمت میں بعد از سلام مسنون دعاؤں کی درخواست ہے۔ میرا ایک اور عریضہ خدمت اقدس میں پہنچا ہوگا۔ فقط والسلام

طالب دعا: عبد الرؤف خاں

باب التقریظ والانتقاد

علامہ حمید الدین فراہیؒ حیات وافکار (مقالات فراہی سیمنار)

مرتبہ پروفیسر عبید اللہ فراہی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۵۹۲ مجلد مع خوبصورت گردپوش، قیمت ۱۵۰ روپیے، پتے (۱) دائرہ حمیدیہ مدرستہ الاصلاح سرائمیر، اعظم گڈھ یوپی (۲) مکتبہ فراہی جی ۵، ۱۰، ابوالفضل انکلیو جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵۔

انجمن طلبہ قدیم مدرستہ الاصلاح سرائے میر کی دعوت پر اکتوبر ۱۹۹۱ء میں ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ پر جو سیمنار ہوا تھا، یہ اس میں پڑھے گئے مضامین کا مجموعہ ہے جسکو خوش سلیقگی اور اہتمام سے شایع کیا گیا ہے، شروع میں لایق مرتب کی وضاحتی تحریر، ڈاکٹر اشتیاق ظلی کا خطبۂ استقبالیہ، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے افتتاحی، علامہ فراہیؒ کے تلمیذ مولانا نجم الدین اصلاحی کے صدارتی اور مولانا سید محمد عبد الغفار ندوی مجددی کے تاثراتی کلمات درج ہیں اور آخر میں سیمنار کے پروگرام کی تفصیل اور اس کے بارے میں اخباروں اور رسالوں میں شایع ہونے والی رپورٹ کے حوالے دیے گئے ہیں، درمیانی حصہ مقالات پر مشتمل ہے جن کی تعداد ۲۸ ہے، اس کی ابتدا ڈاکٹر ظفر الاسلام کے مختصر سوانحی مقالہ سے کی گئی ہے۔

اس مجموعہ کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس میں پہلی دفعہ مولانا فراہیؒ کے افکار وخیالات زیر بحث آئے ہیں، مقالات متنوع ہیں اس لیے ان کو مختلف عنوانات کے تحت دیا جانا چاہیے تھا۔ جیسے ایک حصہ میں ان کے اصول تاویل وطریقہ تفسیر سے متعلق مضامین دیے جاتے، دوسرے میں حدیث وسنت کے بارے میں ان کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کی جاتی علیٰ ھذا

القیاس ہر پہلو سے متعلق مضامین الگ الگ دینے کی ضرورت تھی۔

ظاہر ہے کہ یہ سب مضامین یکساں سطح اور معیار کے نہیں ہیں، تاہم بعض خوب ہیں "حدیث وسنت کی تحقیق کا فراہی منہاج" (خالد مسعود) خاص طور پر اہم ہے اس سے حدیث وسنت کے بارے میں مولانا کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کا حق ادا ہوگیا ہے۔ ان کا مضمون "امام فراہیؒ کے نزدیک حکمت کا مفہوم" بھی قابل ذکر ہے۔ ادب، بلاغت اور زبان واسلوب کے لحاظ سے جو مضامین مولانا کی تصانیف کے جائزہ پر مشتمل ہیں ان میں "علامہ فراہیؒ اور مفردات قرآن کی تحقیق (مولانا آفتاب عالم ندوی)" "قرآن مجید کے بعض اسالیب سے متعلق مولانا فراہیؒ کی توضیحات۔ ایک مطالعہ" (مولانا نعیم الدین اصلاحی) "مولانا فراہیؒ کے تنقیدی نظریات، جمہرۃ البلاغۃ کی روشنی میں" (پروفیسر محمد راشد ندوی) مولانا فراہیؒ اور شعریات مشرق (ڈاکٹر عبد الباری) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر اجمل اصلاحی نے بڑی کد وکاوش سے مولانا کی تصنیفات کا پتہ لگا کر ان کا تعارف کرایا ہے، اس کے حواشی میں ایک جگہ مولانا کی تصنیف حکمۃ القرآن کے مرتب ہونے کے باوجود اسے شایع نہ کیے جانے کا ذکر ہے، اس سلسلہ میں مولانا بدر الدین اصلاحی مدظلہ نے مجھے بتایا تھا کہ اس میں اور حکمت پر تدبر میں شایع ہونے والے مضمون میں فرق ہے اس لیے وہ مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہ کے پاس موجود نسخے کے حصول کی فکر میں ہیں۔ اس مجموعہ کا بڑا قیمتی مضمون "عقاید وشرائع میں نظم کے بعض پہلو۔ فکر فراہیؒ کی روشنی میں" (پروفیسر عبید اللہ فراہی) ہے، اس سے اور بعض مضامین پر ان کے مفید حواشی سے ان کی تحقیق وجستجو اور اچھی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے، ان کی یہ وسیع النظری بھی قابل داد ہے کہ سیمنار میں پڑھے گئے ان مضامین کو بھی بجنسہ شایع کر دیا ہے جن میں مولانا کے افکار پر قصور فہم اور قلت تدبر کی وجہ سے بعض نامناسب اعتراضات کیے گئے ہیں، لیکن ان مضامین کو

شایع کرنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی جن میں مولانا کے افکار کی صحیح ترجمانی نہیں کی گئی ہے بلکہ مضمون نگاروں نے اپنے ذاتی آراء و نظریات کو مولانا کی جانب منسوب کرنے کی کوشش کی ہے گو لایق مرتب کے عالمانہ حواشی میں دونوں طرح کے مضامین کا تشفی بخش جواب دیدیا گیا ہے اس لیے ان سے تعرض کرنے کی ضرورت نہیں تاہم بعض مزید نکتوں کی جانب ذیل میں اشارات کیے جاتے ہیں۔

ایک مضمون میں مولانا کے حوالہ سے کچھ اقتباسات نقل کرکے ان سے کچھ نتائج نکالے گئے ہیں اور پھر یہ فیصلہ صادر کیا گیا ہے کہ "مولانا فراہیؒ فہم قرآن میں روایات سے استفادہ کے قائل نہیں ہیں" (ص ۳۰۱، تا ص ۳۰۳) جب کہ مولانا کا یہ خیال بھی نقل کیا گیا ہے کہ "پہلی چیز جو قرآن کی تفسیر میں مرجع کا کام دے سکتی ہے وہ خود قرآن ہے اس کے بعد نبیؐ اور آپؐ کے اصحاب کا فہم ہے" غالباً جس اقتباس سے یہ اشتباہ ہوا ہے وہ یہ ہے:

"یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ قرآن اپنی تفسیر کے لیے ان فروع [یعنی احادیث، قوموں کے ثابت شدہ اور متفق علیہ واقعات اور گزشتہ انبیاء کے محفوظ صحیفے] کا محتاج نہیں ہے وہ تمام کتابوں کے لیے خود مرکز و مرجع کی حیثیت رکھتا ہے اور جہاں کہیں اختلاف واقع ہو تو اسی کی روشنی جھگڑے کو چکانے والی بنے گی، لیکن اگر تم کو قرآن مجید کی تصدیق و تائید کی ضرورت ہو تو ان فروع کی مراجعت سے تمہارے ایمان و اطمینان میں اضافہ ہوگا" (ص ۳۰۲)

مولانا کا مقصد بالکل واضح ہے کہ تفسیری ماخذ میں سب سے اول درجہ قرآن مجید کو دیا جائے گا، احادیث کا درجہ اس کے بعد ہوگا، یہ متفق علیہ مسئلہ ہے کہ تمام مسائل میں اولین مرجع قرآن مجید قرار پائے گا، احادیث اور دوسرے ماخذ پر اسے ترجیح حاصل ہوگی اس لیے مولانا کے نزدیک اگر حدیث قرآن مجید کے منطوق کے خلاف ہوگی تو ایسی صورت میں قرآن مجید

حکم قرار پائے گا کیونکہ وہ قطعی الدلالت ہے دوسرے ماخذ خواہ احادیث ہی کیوں نہ ہوں وہ یا تو ظنی الدلالت ہیں یا ان کی وہ حیثیت نہیں ہے جو قرآن مجید کی ہے۔ پتہ نہیں اس واضح اور صاف مسئلہ کو کیوں پیچیدہ بنا کر مولانا کو حدیث کا مخالف ثابت کرنے کی کوشش کیجاتی ہے۔

ص ۳۲۲ پر مولانا کی تفسیر سورۂ لہب کے ایک اقتباس کی مثال غلط دی گئی ہے مقالہ نگار کا مقصد یہ دکھانا ہے کہ مولانا زمانۂ نزول سے متعلق روایات قبول نہیں کرتے جبکہ اقتباس میں اس کا ذکر ہے کہ اس سورۂ لہب کے زمانہ نزول سے متعلق کوئی روایت ہم تک نہیں پہنچی۔

ص ۴۱۹ تا ۴۲۱ پر سیرۃ النبیؐ حصہ اول کی بحث ایلاء و تخییر... کا موازنہ مولانا فراہیؒ کی تفسیر سورۂ تحریم سے کیا گیا ہے، اس میں بحث و تحقیق کا یہ نکتہ فراموش کر دیا گیا ہے کہ دونوں کتابوں کی تالیف کے سنین کی کوئی صراحت نہیں کی گئی ہے۔

ص ۴۲۳ پر سورۂ برأت کے تعلق سے درج ہے کہ "اور نہ ہی ان (مولانا فراہیؒ) کی تفسیر میں اس موضوع پر کوئی واضح بحث ہے"۔ یہ صحیح ہے کہ سورۂ برأت کی تفسیر مولانا نے نہیں لکھی لیکن تحقیق متقاضی تھی کہ اس بارے میں مولانا کے خیالات ان کے حواشی قرآن مجید سے معلوم کیے جاتے یا ان کے شاگرد رشید مولانا امین احسن اصلاحی کی تفسیر دیکھی جاتی۔

اسی مضمون میں حضرت ابراہیمؑ کو حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کے حکم کے سلسلے میں جو معترضانہ بحثیں کی گئی ہیں فاضل مرتب نے ایک حد تک ان کا جواب دیدیا ہے، البتہ قربانی سے متعلق آیات کا جو مفہوم مضمون نگار نے بیان کیا ہے وہ چونکہ ان کے ذہن میں پہلے سے موجود تھا اس لیے وہ آیات کے کسی دوسرے مفہوم کو مستبعد خیال کرتے ہیں۔ اس طرح کے موقع پر خالی الذہن ہو کر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اس نکتہ پر بھی غور نہیں کیا گیا کہ کتب عقائد میں بھی یہ تعبیر موجود ہے۔

ص ۳۴۴ کے ایک حاشیہ میں ہے "انہیں (منشی امین زبیری کو) علامہ شبلیؒ سے گہری عقیدت تھی" لیکن یہ عقیدت بعد میں نفرت میں تبدیل ہوگئی تھی۔

"حساس نگاہی اور علامہ فراہیؒ" کا عنوان عجیب سا ہے، یہ مضمون عموماً حوالے سے خالی ہے، اس کے آخری حصہ کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"علامہ کی حساس طبیعت یک رخی ہرگز نہ تھی کہ قرآن کے دیے ہوئے اصل پروگرام اور نصب العین سے وہ باخبر (غالباً بے خبر) ہی رہتے یا وہ اس کو نظرانداز کرکے گزر جاتے اور ان کے فکر و فلسفہ میں اسے کوئی مقام حاصل نہ ہو سکتا۔" (ص ۱۴۶)

آگے مولانا کی کچھ تحریریں پیش کرکے دکھایا ہے کہ قرآن مجید کا اصل پروگرام و نصب العین "غلبہ حق" ہے کیا یہ یک رخا تجزیہ نہیں ہے؟ لیکن اس کی ذمہ داری نہ مولانا فراہیؒ پر ہے اور نہ قرآن مجید پر۔

ص ۴۶۱ پر "ایک بزرگ عالم دین" پر ناروا انداز میں طنز کیا گیا ہے۔

مولانا کی تصنیف ملکوت اللہ پر دو مضامین درج ہیں، دونوں میں اور باتوں سے قطع نظر مقالہ نگاروں نے اپنے مزعومہ خیالات و تصورات کو مولانا فراہیؒ پر تھوپنے کی کوشش کی ہے مثلاً

ص ۴۵۰ تا ۴۵۹ پر "اسلامی حکومت کی قانونی بنیادیں" کے زیر عنوان جو آیتیں نقل کی گئی ہیں وہ آیتیں اور یہ عنوان اولاً تو ملکوت اللہ میں درج ہی نہیں ہیں ثانیاً ان سب آیتوں کو صرف سیاسی امور یا اسلامی حکومت کی قانونی بنیادوں سے متعلق قرار دینا محض کھینچ تان ہے۔

ص ۴۶۳ پر درج آیت سے ص ۴۶۴ پر جو نتائج نکالے گئے ہیں وہ بھی خود مقالہ نگار کے ہیں۔ مولانا کی کتاب ان سے خالی ہے۔

ص ۴۶۶ و ۴۶۷ پر ملکوت اللہ کے عنوان بناء الخلافۃ علی المعاہدۃ سے ایک عبارت نقل کی گئی ہے اس میں نہ اس نتیجہ کا کوئی ذکر ہے کہ "اس مقصد پاک کی خاطر لوگوں کو آپس میں ایک ایسی ٹھوس اور مضبوط تنظیم قائم کرنی چاہیئے" اور نہ اس کی تردید کی گئی ہے کہ "حکومت الٰہیہ کے قیام کو ایسا انعام تصور نہ کیا جائے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دین دارانہ زندگی گزارنے کے صلے میں عطا ہو جاتی ہے" (ص ۴۶۵)

مولانا کی تحریر کا مستفاد یہ ہے کہ "خلافت کی بنیاد معاہدہ پر ہوتی ہے اور اس کی غرض و غایت لوگوں کو نقطہ وحدت اور مرکزیت پر اکٹھا کرنا ہے تاکہ افراد میں مکمل اتحاد و ہم آہنگی رہے اور ان میں کوئی اختلاف و تصادم نہ رہ جائے، ان کا وجود ساری دنیا کیلئے رحمت بن جائے نیز خلافت کے معاہدہ و نظام کو درہم برہم ہونے اور اسے قائم و برقرار رکھنے کے لیے پوری کوشش کرنی چاہیے، اس سلسلہ میں اپنی عزیز ترین آزادی و خودداری کو بھی قربان کر دینا چاہیے۔

اس بحث کو سمجھنے کے لیے مولانا کی تفسیر سورۂ والشمس کا مطالعہ کرنا چاہیئے اس میں خلافت کو باقی رکھنے کے لیے حضرت عثمانؓ کی سعی بلیغ اور جان سے ہاتھ دھونے کا ذکر ہے۔

یہ بھی واضح رہے کہ دیندارانہ زندگی کے بغیر محض جوش اور نعرہ سے حکومت الٰہیہ قائم نہیں ہو سکتی۔

کہیں کہیں مقالہ نگار مولانا کا مدعا سمجھنے سے قاصر رہے ہیں جیسے:-

وکما ان الحاکم علیہم من ھو	جس طرح امت کا خلیفہ وہ ہوگا جو
خیرھم اعلمھم باللہ بعیر	ان میں سب سے اچھا، سب سے زیادہ

واتقاهم لله واقواهم	انتظامی صلاحیت والا اور سب سے
فی العزم فکذلک الذین	زیادہ تقویٰ والا اور سب سے زیادہ
یعینونه بالمشورة ویساعدونه	باعزم و ہمت ہو، اسی طرح وہ لوگ
بانفاذ الامور	بھی ہونے چاہییں جو اس کو اپنے
(ملکوت اللہ ص۲۴)	مشورہ کے ذریعہ مدد دیتے ہیں اور
	معاملات کو نافذ کرنے میں ان کے لیے
	قوت کا ذریعہ بنتے ہیں۔ (ص۴۶۵)

اعلمهم بالتدبیر ... دراصل خیرهم کی توضیح و بیان ہے جس کی رعایت ترجمہ میں نہیں کی گئی ہے، فکذلک سے جو عبارت شروع ہوتی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ خلیفہ ہی کی طرح اس کے مشیر و معاون کو بھی مدبر، متقی اور قوی العزم ہونا چاہیے۔

ولا یکون احد من اولی الامر	کوئی آدمی حاکم اسی وقت ہو سکتا ہے
الا بما ظهر من صالح اعماله	جب اس کی طرف اعمال صالحہ ظاہر
(ملکوت اللہ ص۲۴)	ہوں (ص۴۶۶)

بات اہل الحل والعقد یعنی اولوالامر کی ہو رہی ہے لیکن اسے حاکم سے متعلق کر دیا گیا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اولوالامر سے حاکم مراد لیا جا رہا ہے۔

فجعلوه وکیلا فی اکبر الامور	اور اسے اپنے اکثر و بیشتر معاملات کا
(ملکوت اللہ ص۲۵)	اپنا ذمہ دار بناتے ہیں (ص۴۶۶)

اکبر الامور سے اکثر و بیشتر معاملات مراد نہیں ہیں بلکہ سب سے بڑا اور اہم معاملہ یعنی انتخاب امیر مراد ہے۔

وکما ان اللہ تعالیٰ یعذب القوم	جس طرح اللہ تعالیٰ مغضوب اقوام کو
المهجور اولیومنوا (ملکوت اللہ ص۴۵)	عذاب دیتا ہے۔ (ص۴۷۹)

اولیومنوا کا ترجمہ ہی نہیں کیا گیا اور مهجور کا ترجمہ مغضوب محل نظر ہے، کیونکہ یہ ہجرت کے اصطلاحی لفظ سے مفعول کا صیغہ ہے۔

بعض جگہ ادھوری عبارت نقل کی ہے مثلاً

ووجب علیهم ان یعطوا لها اکرم وانفس ما لدیهم (ملکوت اللہ ص۳۱، مقالہ ص۴۶۷ و ۴۶۸) یہاں اکرم وانفس کی توضیح کرنے والے بعد کے الفاظ وهو الحیاة والانفة کو معلوم نہیں کیوں چھوڑ دیا گیا ہے۔

اب دوسرے مقالہ کو لیجیے اس میں جابجا مولانا کے افکار کی صحیح ترجمانی نہیں کی گئی ہے ملاحظہ ہو:

"مولانا کا کہنا ہے کہ کوئی امت جب بنیادی صفات سے محروم ہو جائے تو اس کے درمیان کسی بادشاہ کا پیدا ہو جانا بھی گرچہ وہ ظالم اور جبار ہو، اللہ کی رحمت کا مظہر ہے" (ص۴۹۱)

یہ مولانا کے ان الفاظ کی ترجمانی ہے فمن رحمة اللہ ان یتیح لهم ملکا یزعهم عن الفساد فی الارض وان کان جبارا (ملکوت اللہ ص۲۶)

مولانا نے صرف جبار کہا تھا مگر ترجمانی میں وہ ظالم و جبار ہو گیا، مصنف نے بادشاہ کی یہ اہم خصوصیت بتائی تھی کہ وہ لوگوں کو فساد فی الارض سے روکتا ہے، لیکن اس موقع پر اسے نہ پیش کر کے مولانا کی غلط تصویر پیش کی گئی ہے۔

آگے لکھا ہے "مولانا کا استدلال یہ ہے کہ بادشاہوں کے وجود کو ارباب دانش گوارا کر لیتے ہیں اور جبری حکومت کی اطاعت کرنے لگتے ہیں کیونکہ اس کے سوا کوئی چارہ

نظر نہیں آتا،" (ص ۴۹۶)

مولانا فراہیؒ کی اصل عبارت یہ تھی ولذلک (ای وزع الملک عن الفساد) یرضی بھا (ای بالملکیۃ) اھل العقل منھم فیطیعون الحکومۃ الجبریۃ وبھذا امرنا اللہ ورسولہ (ملکوت اللہ ص ۳۶)

مولانا گوارا کر لینے کے بجائے بادشاہت کو پسند کرنے کی بات کہتے ہیں، انھوں نے چارہ نظر نہ آنے کی بات بھی نہیں کہی ہے بلکہ یہ فرمایا ہے کہ وازع فساد جبری حکومت کی اطاعت کرنے کا حکم خدا اور رسولؐ نے دیا ہے، اس نکتہ کو نہ سمجھنے کی بنا پر مقالے میں مولانا پر تاریخ اسلام کی روایات سے انحراف، مفاہمت ناروا اور اسلام کے انقلابی پیغام سے میل نہ کھانے والی بات کرنے کا الزام لگایا ہے اس کا اور عدم تدبر کی وجہ سے بعض دوسرے اعتراضات کا جواب فاضل محشی نے دیدیا ہے، اس لیے ان سے تعرض نہیں کیا جا رہا ہے۔

ایک اور جگہ لکھا ہے:

"مولانا فراہیؒ کا یہ انقلابی نظریہ بھی لائق مطالعہ ہے کہ معاشرہ میں بنیادی مسئلہ حریت اور عدل و قسط کا قیام ہے اور انتخاب امیر کی آزادی اس کی علامت ہے، اگر یہ بنیادی قدریں موجود نہ ہوں تو بادشاہ کی ذاتی نیکی اور اس کا تقوی مطلوب و محمود نہیں ہے، مولانا کا کہنا ہے کہ اصل مطلوب نظام کی تبدیلی ہے، محض ہاتھ کی تبدیلی سے معاشرہ میں کوئی خوشگوار اثر رونما نہیں ہوگا،" (ص ۴۹۸ و ۴۹۹)

مولانا کے اس انقلابی نظریہ کا حوالہ نہیں دیا گیا ہے، اس سے خیال ہوتا ہے کہ اپنے مزعومات ان کی جانب منسوب کر دیے گئے ہیں۔ "ض"

ادبیات

سانحہ

از ڈاکٹر افتخار بیگم۔ دہلی۔

یہ سانحہ تو زمانہ کی آنکھ نے دیکھا
جو میرے معبد دیریں پہ آج گزرا ہے

مگر کسی کو خبر کیا کہ آج جو عالم
دل شکستہ و قلب حزیں پہ گزرا ہے

مجھے یہ غم ہے کہ رسوا ہوئی زمانے میں
زمین ہند کی عظمت کی داستان کہن

خود اپنے دیس کے کچھ سورماوں کے ہاتھوں
ملی ہے خاک میں اس طرح آبروئے وطن

جو سرزمین کہ تھی گہوارہ امن و الفت کا
جہاں کو جس سے ملا تھا سبق محبت کا

کبیر و نانک و چشتی کی سرزمین ہے جو
وہیں یہ کھیلا گیا تانڈو ناچ نفرت کا

مگر یہ کالی گھٹائیں جو آج چھائی ہیں
ہمارے عزم سے محنت سے چھٹ بھی سکتی ہیں

دلوں میں دیپ محبت کے پھر اگر جل جائیں
اندھیری راتیں یہ نفرت کی کٹ بھی سکتی ہیں

چلو کہ عشق کی رسم کہن کو تازہ کریں
دلوں کے زخموں پہ پھر رکھدیں پیار کا مرہم

قدم ملا کے چلیں پھر سے جانب منزل
جو ماں کے دودھ کا ہے قرض یوں چکا دیں ہم

مطبوعات جدیدہ

شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ

از جناب مولانا فرید الوحیدی،

متوسط تقطیع، بہترین کاغذ، اعلیٰ کتابت وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۸۵۶، قیمت ۲۵۰ روپیے

پتہ: قومی کتاب گھر ۹/۱ ذاکر نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵۔

شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ علم و عمل، اخلاق و کردار، عزیمت و حمیت اور جرأت و جہاد میں سلف صالحین کا نمونہ اور اسلامی تعلیمات کی مجسم تصویر تھے، ان کی کتاب حیات کا ہر نقش ملت خصوصاً ہندوستانی مسلمانوں کے لیے آج بھی شمع راہ ہے۔ مولانا کے سوانح اور ان کی ملی و ملکی خدمات پر ان کی آپ بیتی کے علاوہ اب تک کئی اور عمدہ کتابیں شایع ہو چکی ہیں، زیر نظر کتاب مولانا کے حقیقی برادر زادہ اور مولانا سید وحید احمد مدنی مرحوم کے صاحبزادہ مولانا سید فرید الوحیدی نے محنت و کاوش اور ذاتی معلومات اور معاصر شہادتوں اور دستاویزوں کی مدد سے مرتب کی ہے، تقریباً ساڑھے آٹھ سو صفحات کے اس تذکرہ میں انھوں نے مولانا مدنی کے نسب، خاندان، مدینہ میں قیام، مالٹا کی اسیری، ہندوستان واپسی، دارالعلوم دیوبند اور سلہٹ کی مسند حدیث پر رونق افروز ہونے، جمعیۃ العلماء اور کانگریس سے وابستگی، جنگ آزادی، سیاسی فکر و مسلک اور انگریزوں کے رخصت ہونے کے بعد ملک کے المناک حوادث اور وفات تک کے حالات کا احاطہ کیا ہے۔ خاص طور پر خاندانی پس منظر، خاندان کے دوسرے افراد کے حالات، مدینہ طیبہ کے قیام اور مالٹا کی اسیری کی داستان میں جزئیات تک کو

اس تفصیل سے بیان کیا ہے کہ سوا دو سو صفحات اسی کی نذر ہو گئے ہیں، بعد کے صفحات میں کانگریس اور مسلم لیگ کی گویا مکمل تاریخ آگئی ہے۔ البتہ ہٹلر اور اتحادی فوجوں کی اس درجہ تفصیل کی ضرورت نہیں تھی، سیاسی جماعتوں کی آویزش، کیبنٹ مشن، ڈائرکیٹ ایکشن وغیرہ کی تفصیل وطوالت سے کتاب کے حجم میں اضافہ ہوا ہے لیکن اس سے اس دور کی مکمل تاریخ بھی سامنے آجاتی ہے، البتہ مولانا مدنی کی علمی و روحانی اور تدریسی و تربیتی زندگی کا پہلو تشنۂ تکمیل رہ گیا، فاضل مولف کو اس کا احساس ہے اور اس کے لیے ان کے قلم سے کتاب کے دوسرے حصہ کی تکمیل کی خوشخبری بھی ہے۔ مولانا مدنی کے عزیز قریب اور معتقد ہونے کے باوجود ان کے سیاسی مسلک کی عمدہ شرح و ترجمانی کی ہے اور تجزیہ و محاکمہ میں اعتدال کو ملحوظ رکھا ہے، تاہم اپنے ممدوح کے فضل و کمال کو ثابت کرنے کے لیے امت کے اور مشاہیر کا استہزا و استخفاف ضروری نہیں تھا۔ مثلاً "سرسید کی تحریک سے لے کر انگریزوں کے زمانہ کی انتہا تک ایسے ہزاروں مولوی، مولانا، علماء، فضلاء، مرشدین، واعظین، مدرسین و مصنفین تھے جن کو حکومت برطانیہ نے یونیورسٹیوں، ریاستوں، وظیفوں، خطابوں، علی گڑھ، حیدرآباد، انعامات اور ممبریوں کے ناموں سے خرید کر بالکل خاموش اور ساکت و جامد کر دیا تھا۔" خیالات میں بھی کہیں کہیں ناہمواری ہے، مثلاً ایک جگہ سرسید اور آغا خاں (سہو کتابت سے آغا جان) پر سخت طنز و اعتراض ہے لیکن بعد کے صفحات میں سرسید کی تعریف بھی ہے۔ شرفائے قدیم کے طور طریقوں کا ذکر کئی بار کیا گیا ہے جو کہیں کہیں قطعی بے محل ہے جیسے "اس وقت تک شرفاء کے طبقہ کی شادی بیاہ میں اس بات کا لحاظ باقی تھا کہ جہاں تک ممکن ہو شادی اپنے ہی خاندانوں اور عزیز داروں میں کیجائے" حالانکہ "غیر شرفا" میں بھی اس شریفانہ عمل کا چلن تھا۔ واقعات کی تکرار کے ساتھ

الفاظ و مترادفات میں فراخدلی کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو "لوگ عوام، خواص، علماء، صلحاء، اتقیاء، روسا، امراء اور اہل کاران حکومت، معتقدوں، مداحوں اور مستفیدوں کے زمرہ میں شامل ہو رہے تھے" نیز "ذکر و شغل، مراقبہ، تصوف، پاس انفاس اور تزکیہ نفس" بعض تعبیرات اور الفاظ کا استعمال بھی کھٹکتا ہے جیسے "کافی سے بہت زیادہ ہے" "لحاظ ملاحظہ" "آنچ سلگ رہی تھی" "عالم باعمل اولاد، شیخ کامل کے خصوصی شاگرد اور صحبت یافتہ لڑکے" "اب کسی دینی اشغال میں کوئی رکاوٹ نہ تھی" "زیبائشات" "ایک مرتبہ راستہ کھل جاتا تو کیسی کیسی شانیں، راحتیں اور آسائشیں ملتی رہتیں" "مولویانہ و مولانانہ" بہادر شاہ ظفر کو شہنشاہ ظفر لکھا گیا ہے۔ شرعی حیثیت کے علاوہ کیا واقعۃً وہ شہنشاہ کہلانے کے مستحق تھے؟ "عیسیٰ مسیح تو صلیب ہی پر چڑھتے ہوئے سمجھے تھے" اس جملہ کی کیا ضرورت تھی! ان کے بعض خیالات محل نظر ہیں مثلاً "جمعیۃ علمائے اسلام کے بزرگوں کا برصغیر کے مسلمانوں کی قسمت بنانے یا بگاڑنے میں سب سے بڑا حصہ تھا" کتاب میں مولانا مدنیؒ کی بعض اہم تقریروں اور تحریروں کے اقتباسات بھی جمع کیے گئے ہیں جو آج بھی دعوت فکر و نظر دیتے ہیں، ایک سوال کے جواب میں مولانا مدنی نے فرمایا تھا "مسلمان اپنے مذہبی اور سیاسی حقوق کی حفاظت اپنی قوت اور قربانی سے کر سکتے ہیں نہ کہ کانگریس اور انگریزوں کے وعدوں سے"۔

کھٹی میٹھی باتیں

از جناب حید ربیابانی، متوسط تقطیع، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۰۲، قیمت ۱۵ روپیے پتہ، حید ربیابانی، اچلپور شہر ضلع امراوتی، مہاراشٹر۔

بہار کے ایک نوجوان شاعر حید ربیابانی نے اس سے پہلے بچوں کی نظموں اور گیتوں پر ایک مجموعہ کلام شایع کیا تھا، اس مجموعہ میں انکی چند غزلیں اور گیت ہیں گیتوں میں نسوانی جذبات کی اچھی عکاسی ہے، ہر صفحہ پر اشعار کی روح کو دیدہ کے قابل بنانے کا مصورانہ تجربہ بھی ہے جو کہیں کہیں طبع لطیف پر گراں گزرتا ہے۔

(ع۔ ص)

سلسلۂ سیر الصحابہؓ

حصۂ اول (خلفائے راشدین) حاجی معین الدین ندوی: اس میں خلفائے راشدین کے ذاتی حالات و فضائل، مذہبی اور سیاسی کارناموں اور فتوحات کا بیان ہے۔ ۴۰/=

حصۂ دوم (مہاجرین۔ اول) حاجی معین الدین ندوی: اس میں حضرات عشرہ مبشرہ، اکابر بنی ہاشم و قریش اور فتح مکہ سے پہلے اسلام لانے والے صحابہ کرامؓ کے حالات اور ان کے فضائل کا بیان ہے ۴۵/=

حصۂ سوم (مہاجرین دوم) شاہ معین الدین احمد ندوی: اس میں بقیہ مہاجرین کرامؓ کے حالات و فضائل بیان کیے گئے ہیں۔

حصۂ چہارم (سیر الانصار اول) سعید انصاری: اس میں انصار کرام کی مستند سوانح عمریاں ان کے فضائل و کمالات مستند ذرائع بہ ترتیب حروف تہجی لکھے گئے ہیں۔ ۴۵/=

حصۂ پنجم (سیر الانصار دوم) سعید انصاری: اس میں بقیہ انصار کرام کے حالات و فضائل درج ہیں۔ ۳۵/=

حصۂ ششم شاہ معین الدین احمد ندوی: اس میں چار اہم صحابہ کرامؓ، حضرات حسنینؓ، امیر معاویہؓ اور حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کے حالات، ان کے مجاہدات اور باہمی سیاسی اختلافات بشمول واقعہ کربلا درج ہیں۔ ۳۵/=

حصۂ ہفتم (اصاغر صحابہؓ) شاہ معین الدین احمد ندوی: اس میں ان صحابہ کرام کا ذکر ہے، جو فتح مکہ کے بعد مشرف بہ اسلام ہوئے یا اس سے پہلے اسلام لا چکے تھے مگر شرف ہجرت سے محروم رہے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں کمسن تھے۔ ۴۰/=

حصۂ ہشتم (سیر الصحابیاتؓ) سعید انصاری: اس میں آنحضرتؐ کی ازواج مطہرات و بنات طاہرات اور عام صحابیاتؓ کی سوانح حیات اور ان کے علمی اور اخلاقی کارنامے درج ہیں۔ ۲۵/=

حصۂ نہم (اسوۂ صحابہؓ اول) عبدالسلام ندوی: اس میں صحابہ کرامؓ کے عقائد، عبادات، اخلاق اور معاشرت کی صحیح تصویر پیش کی گئی ہے۔ ۴۰/=

حصۂ دہم (اسوۂ صحابہؓ دوم) عبدالسلام ندوی: اس میں صحابہ کرامؓ کے سیاسی، انتظامی اور علمی کارناموں کی تفصیل دی گئی ہے۔ ۴۵/=

حصۂ یازدہم (اسوۂ صحابیات) عبدالسلام ندوی: اس میں صحابیات کے مذہبی، اخلاقی اور علمی کارناموں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ ۱۵/=